محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
جنوری ۲۰۱۰ء

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول: ڈاکٹر اسرار احمد

خصوصی مضمون

اقامتِ دین کی جِدّوجُہد
فرضِ عین ـ یا ـ فرضِ کفایہ

بانیٔ تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی چند فکر انگیز تصانیف

داعیٔ رجوع الی القرآن کا شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن
اب کتابی شکل میں بعنوان
بیان القرآن
حصہ اوّل۔ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرہ مع تعارفِ قرآن
صفحات: 520 قیمت: 400 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر کے
شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے
حقیقت و اقسامِ شرک
قیمت اشاعت عام: 50 روپے، خاص: 90 روپے

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں
اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم
منہجِ انقلابِ نبوی
مجلد 300 روپے غیر مجلد 200 روپے

بعثتِ انبیاء کا اساسی مقصد
بعثتِ محمدیؐ کی اتمامی و تکمیلی شان
نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت
اشاعت خاص 40 روپے، عام 30 روپے

ایک مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی
ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
دینی فرائض کا جامع تصور
اشاعت خاص 25 روپے، عام 15 روپے

ایمان کے نظری اور شرعی حصے میں ایمان کا فلسفہ ایمان و عمل کا باہمی تعلق
اپنے موضوع پر لاثانی تحقیقی و فکری تصنیف
حقیقتِ ایمان
اشاعت خاص 120 روپے

سورۃ العصر کی روشنی میں
راہِ نجات
اشاعت خاص 45 روپے، عام 30 روپے

قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ؟
عید الاضحی اور فلسفۂ قربانی
اشاعت خاص 25 روپے، عام 15 روپے

اُمتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل
اور نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت
مجلد 100 روپے، غیر مجلد 45 روپے

پاکستان اور ملتِ اسلامیہ کے حال اور مستقبل کے
تناظر میں لکھے گئے فکر انگیز اخباری کالموں کا مجموعہ
بصائر
صفحات: 130 قیمت: 65 روپے

تحریکِ پاکستان کا تاریخی و سیاسی پس منظر
اسلامیانِ پاکستان کا تہذیبی و ثقافتی پس منظر
اسلام اور پاکستان
اشاعت خاص 60 روپے، عام 35 روپے

برعظیم پاک و ہند میں
اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل
اور اس سے انحراف کی راہیں
اعلیٰ ایڈیشن 50 روپے

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی اور مقبول عام دستاویز
جس کا انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی میں ترجمہ ہو چکا ہے
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
اشاعت خاص 40 روپے، عام 20 روپے

سابقہ اور موجودہ
مسلمان اُمتوں کا ماضی، حال اور مستقبل
اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری
اشاعت خاص 100 روپے

ڈاکٹر صاحب کے دو خطبات کا مجموعہ
اسلام میں عورت کا مقام
اشاعت خاص 80 روپے، عام 50 روپے

مفصل فہرست طلب کیجیے

مکتبہ خدام القرآن 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 3-042-35869501، فیکس: 042-35834000
email: maktaba@tanzeem.org

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد :	59
شمارہ :	1
محرم الحرام	1431ھ
جنوری	2010ء
فی شمارہ	20/-

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مجلس ادارت

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 200 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

فون: 36316638 - 36366638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

✿ **عرضِ احوال** ——— 3

ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے ! — ایوب بیگ مرزا

✿ **بیانُ القُرآن** ——— 5

سورۃ النساء (آیات ۷۱ تا ۹۱) — ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **حقیقتِ دین** ——— 25

اسلام کے تصورِ توحید کی امتیازی حیثیت — عتیق الرحمٰن صدیقی

✿ **مقصدِ حیات** ——— 31

آزادی یا بندگی؟ — محمد عمران صدیقی

✿ **دعوتِ فکر** ——— 39

فرضیتِ اقامتِ دین — اویس پاشا قرنی

✿ **بحث و نظر** ——— 61

حضرت امام مہدی: خلیفۂ اوّل' دوم یا سوم؟ — محمد نذیر یٰسین

✿ **انٹرویو** ——— 77

حضرت مولانا آصف قاسمی — ادارہ

✿ **اُسوہ و سیرت** ——— 93

امام معمر بن راشدؒ — عبدالرشید عراقی

❀ ❀ ❀

عرضِ احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے!

اسلامی کیلنڈر کا آغاز ہجرت سے ہوتا ہے جو تیرہ (۱۳) نبوی میں ہوئی۔ شماریات کے اس سلسلے کا آغاز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا۔ یوں تو حضرت عمرؓ نے صحابیٔ رسولؐ اور خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مشیر کی حیثیت سے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے لیکن آپؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اسلامی ریاست کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ داخلی سطح پر انتظامی لحاظ سے ایسے فیصلے کیے جن سے ان کا دورِ قدیم اور جدید ادوار کے مابین ایک پل کی حیثیت سے دکھائی دیتا ہے۔ آپؓ نے اسلام کے تمام بنیادی اصولوں (fundamentals) پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے اپنے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کی۔ اسلامی کیلنڈر کا آغاز بھی ایسے فیصلوں میں سے ایک تھا۔ اسلامی کیلنڈر کا آغاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش یا نبوت کے اعلان سے کیا جا سکتا تھا، لیکن ہجرت سے اس کا آغاز بڑا معنی خیز اور دور اندیشی کا مظہر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ جدوجہد پر نگاہ ڈالیے۔ اگرچہ ایک ایک واقعہ سنہری حروف سے قلم بند کرنے کے قابل اور ایک ایک لمحہ سنہری ظروف میں محفوظ کرنے کے لائق ہے، لیکن ہر مؤرخ اتفاق کرتا ہے کہ سیرتِ مبارکہ کی تاریخ میں ہجرت کا واقعہ اسلامی انقلاب کے لیے فیصلہ کن موڑ (turning point) ثابت ہوا، لہٰذا اسلامی کیلنڈر کے آغاز کے لیے ہجرت کے واقعہ کا انتخاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فہم و فراست کا شاہکار تھا۔

محرم الحرام ہجری سال کا پہلا اور اشہرِ حُرم کا آخری مہینہ ہے، جن کی ترتیب کچھ یوں ہے رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ دورِ جہالت میں بھی اہلِ عرب ان مہینوں کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان میں جنگ و جدل سے باز رہتے تھے۔ بعض روایات کے مطابق ان دنوں میں اگر ان میں سے کسی کو اپنے باپ کا قاتل بھی نظر آ جاتا تو وہ بدلہ نہیں لیتا تھا اگرچہ اس کی تلاش کو اس نے زندگی کا مشن بنایا ہوتا تھا۔ لیکن دلچسپ بلکہ صحیح تر الفاظ میں مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ان مہینوں کو وہ اپنے مفادات، دلچسپیوں اور ضروریات کے مطابق آگے پیچھے کرتے رہتے تھے۔ اب اسے قدرت کا کرشمہ ہی کہیں کہ کئی مرتبہ تلپٹ ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ان مہینوں کی ترتیب پھر درست ہو گئی تھی اور بعد ازاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ترتیب میں الٹ پھیر سختی سے منع فرما دیا تھا۔

محرم الحرام اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ ہے۔اس کی اصل اہمیت تو اشہر الحرم میں سے اس کا شمار ہے' لیکن تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے اہم واقعات اس ماہ میں رونما ہوئے۔عجیب اتفاق یہ کہ خود حضرت عمرؓ نے اس ماہ کی پہلی تاریخ کو جامِ شہادت نوش فرمایا۔اسی ماہِ مبارک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا کا سینہ چاک کر کے راستہ بنایا گیا اور فرعون غرقِ آب ہوا۔اسی ماہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ گل و گلزار میں تبدیل ہوئی۔اسی ماہ میں سانحہ کربلا رونما ہوا اور حضرت حسینؓ نے جرأت و بہادری کی تاریخ رقم کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ایک روایت کے مطابق الساعة جسے قیامت کہا جاتا ہے وہ بھی اسی ماہ برپا ہوگی۔

یہاں ایک وضاحت بڑی ضروری ہے کہ یومِ عاشورہ اور اس سے ایک دن پہلے یا بعد میں جو روزہ رکھا جاتا ہے اس کا سانحہ کربلا سے کوئی تعلق نہیں۔حقیقت میں جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لائے تو وہاں کے یہودی دس محرم کا روزہ رکھتے تھے۔آپ ﷺ نے جب اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دریا کو کامیابی سے عبور کرنا بتایا۔آپ ﷺ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام سے ہمارا تعلق تم سے زیادہ ہے اور مسلمانوں سے کہا کہ اس دن تم بھی روزہ رکھو۔صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ آپؐ اکثر معاملات میں یہودیوں سے خود کو الگ تھلگ رکھتے ہیں تو کیا ہم اس معاملہ میں ان کی تقلید کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا دس محرم کے ساتھ نویں یا گیارہویں محرم کا روزہ بھی رکھ لیا کرو تا کہ ہمارا یہودیوں سے فاصلہ قائم رہے۔بہرحال محرم الحرام ملے جلے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔اس ماہ میں حضرت عمرؓ کی شہادت اور سانحہ کربلا ہوا جس میں خانوادۂ رسول کو بے دردی سے شہید کیا گیا۔اس واقعہ نے تاریخ اسلام کو بڑی بری طرح متاثر کیا' لیکن اس ماہ کے دوران بہت سے مثبت واقعات بھی ہوئے' جن میں صرف چند ایک کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔اس لیے ماہِ محرم الحرام کو محض غم و اندوہ کا مہینہ قرار دے دینا مناسب نہیں۔پھر یہ کہ شہادت تو مؤمن کو مطلوب و مقصود ہوتی ہے اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے جس کی اللہ کے کئی انتہائی نیک اور پرہیزگار بندے خواہش کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں شہید کو زندہ قرار دیتا ہے۔چنانچہ ہمیں تو شاعر سے صدفی صد اتفاق ہے ؎

روئیں وہ جو منکر ہیں شہادتِ حسینؓ کے
ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے!

چنانچہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ بدعات کو ترک کر کے ہم ان زندۂ جاوید صحابہ کرامؓ کی قائم کی ہوئی درخشاں مثالوں کی پیروی کرتے ہوئے دین اسلام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور ضرورت پڑے تو ان کی طرح اسلامی اصولوں کی خاطر جان و مال قربان کر دیں۔○○

سُورَةُ النِّسَاء

آیات ۷۱ تا ۷۶

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا
جَمِیْعًا﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالَ قَدْ
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِیْدًا﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ
اللّٰهِ لَیَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهٗ مَوَدَّةٌ یّٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ مَعَهُمْ
فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا﴿۷۳﴾ فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوةَ
الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ
نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ
وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ
اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۚ
وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا﴿۷۵﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ
الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا﴿۷۶﴾﴾ ع

اب ذکر آ رہا ہے قتال فی سبیل اللہ کا۔ یہ دوسری چیز تھی جو منافقین پر بہت بھاری تھی۔ مادی اعتبار سے یہ بڑا سخت امتحان تھا۔ اطاعتِ رسولؐ زیادہ تر ایک نفسیاتی مرحلہ تھا، ایک نفسیاتی الجھن تھی، لیکن اپنا مال خرچ کرنا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ایک خالص محسوس مادی شے تھی۔

آیت ۷۱ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا خُذُوۡا حِذۡرَکُمۡ﴾ ''اے اہلِ ایمان' اپنے تحفّظ کا سامان (اور اپنے ہتھیار) سنبھالو''

﴿فَانۡفِرُوۡا ثُبَاتٍ اَوِ انۡفِرُوۡا جَمِیۡعًا﴾ ''اور (جہاد کے لیے) نکلو' خواہ ٹکڑیوں کی صورت میں خواہ فوج کی شکل میں۔''

یعنی جیسا موقع ہو اس کے مطابق الگ الگ دستوں کی شکل میں یا اکٹھے فوج کی صورت میں نکلو۔ رسول اللہ ﷺ موقع کی مناسبت سے کبھی چھوٹے چھوٹے گروپ بھیجتے تھے۔ جیسے غزوۂ بدر سے قبل آپؐ نے آٹھ مہمیں روانہ فرمائیں' جبکہ غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد میں آپؐ پوری فوج لے کر نکلے۔ تو ان میں سے جو شکل بھی ہو' نکلو اللہ کی راہ میں!

آیت ۷۲ ﴿وَاِنَّ مِنۡکُمۡ لَمَنۡ لَّیُبَطِّئَنَّ﴾ ''اور تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو دیر لگا دیتے ہیں۔''

حکم ہو گیا ہے کہ جہاد کے لیے نکلنا ہے' فلاں وقت کوچ ہو گا' لیکن وہ تیاری میں ڈھیل برت رہے ہیں اور پھر بہانہ بنا دیں گے کہ بس ہم تو تیاری کر ہی رہے تھے۔ اور وہ منتظر رہتے ہیں کہ جنگ کا فیصلہ ہو جائے تو اُس وقت ہم کہیں گے کہ ہم تو بس نکلنے ہی والے تھے کہ یہ فیصلہ ہم کو پہنچ گیا۔

﴿فَاِنۡ اَصَابَتۡکُمۡ مُّصِیۡبَةٌ﴾ ''پھر اگر تمہیں کوئی مصیبت پیش آ جائے''

اگر جنگ کے لیے نکلنے والے مسلمانوں کو کوئی تکلیف پیش آ جائے' کوئی گزند پہنچ جائے' وقتی طور پر کوئی ہزیمت ہو جائے۔

﴿قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ اِذۡ لَمۡ اَکُنۡ مَّعَهُمۡ شَهِیۡدًا﴾ ''تو وہ کہے گا کہ مجھ پر تو اللہ نے بڑا انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوا۔''

مجھ پر اللہ کا بڑا فضل و کرم ہوا کہ میں پیچھے رہ گیا اور اس معرکے میں جانے سے بچ گیا۔ میری فلاں جو ضرورت تھی وہ میرے لیے رحمت بن گئی۔ اُس وقت میرا جو اونٹ گم ہوا تھا اگر کہیں میرے پاس موجود ہوتا تو میں بھی ان کے ساتھ مصیبت میں گرفتار ہوتا۔

آیت ۷۳ ﴿وَلَئِنۡ اَصَابَکُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''اور اگر تمہیں کوئی فضل پہنچ جائے اللہ کی طرف سے''

یعنی تمہیں فتح ہو جائے اور تم کامرانی کے ساتھ مالِ غنیمت لے کر واپس آؤ۔

﴿لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ﴾ ''تو اُس وقت وہ پھر (حسرت کے ساتھ) کہے گا' جیسے تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں''

﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ ''اے کاش کہ میں بھی ان کے ساتھ گیا ہوتا تو یہ بڑی کامیابی مجھے بھی حاصل ہو جاتی۔''

یہ منافقین کا کردار تھا جس کا یہاں نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔

آیت ۷۴ ﴿فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ ''پس اللہ کی راہ میں قتال کرنا چاہیے ان لوگوں کو جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے عوض فروخت کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

جو لوگ یہ طے کر چکے ہوں کہ ہم نے دنیا کی زندگی کے بدلے میں آخرت قبول کی' ان کے لیے تو قتال فی سبیل اللہ میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اگر انہوں نے واقعی یہ سودا اللہ سے کیا ہے تو پھر انہیں اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلنا چاہیے۔

﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ﴾ ''اور جو کوئی بھی اللہ کی راہ میں قتال کرے گا' تو خواہ مارا جائے یا غالب ہو''

اللہ کی راہ میں قتال کرنے والے کے لیے دو ہی امکانات ہیں' ایک یہ کہ وہ قتل ہو کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہو جائے اور دوسرے یہ کہ وہ دشمن پر غالب رہے اور فتح مند ہو کر واپس آئے۔

﴿فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ ''ہم اسے (دونوں حالتوں میں) بہت بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔''

اگلی آیت میں خاص طور پر ان مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے لیے قتال کی ترغیب دلائی جا رہی ہے جو مختلف علاقوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان میں کمزور بھی تھے' بیمار اور بوڑھے بھی تھے' خواتین اور بچے بھی تھے۔ یہ لوگ ایمان تو لے آئے تھے لیکن ہجرت کے قابل نہیں تھے۔ یہ اپنے اپنے علاقوں میں اور اپنے اپنے قبائل میں تھے اور وہاں ان پر ظلم ہو رہا تھا' انہیں ستایا جا رہا تھا' انہیں تشدد و تعذیب کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ تو خاص طور پر ان کی مدد کے لیے نکلنا' ان کی جان چھڑانا اور ان کو بچا کر لے آنا' یہ غیرتِ ایمانی کا بہت ہی شدید تقاضا ہے' بلکہ یہ

غیرتِ انسانی کا بھی تقاضا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

آیت ۷۵ ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم قتال نہیں کرتے اللہ کی راہ میں''

﴿وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ﴾ ''اور ان بے بس مَردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر جو مغلوب بنا دیے گئے ہیں''

﴿الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا﴾ ''جو دُعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار' ہمیں نکال اس بستی سے جس کے رہنے والے لوگ ظالم ہیں۔''

﴿وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا﴾ ''اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنا دے' اور ہمارے لیے خاص اپنے فضل سے کوئی مددگار بھیج دے۔''

ان کی یہ آہ و بکا تمہیں آمادۂ پیکار کیوں نہیں کر رہی؟ ان پر ظلم ہو رہا ہے' ان پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اپنے گھروں سے نکلنے کو تیار نہیں ہو۔ بعض لوگ اس آیت کا انطباق ان مختلف قسم کے سیاسی جہادوں پر بھی کر دیتے ہیں جو آج کل ہمارے ہاں جاری ہیں اور ان پر ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا لیبل لگایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ بات بالکل ہی قیاس مع الفارق ہے۔ واضح رہے کہ یہ خطاب اُن اہلِ ایمان سے ہو رہا ہے جن کے ہاں اسلام قائم ہو چکا تھا۔ ہم اپنے ملک میں اسلام قائم کر نہیں سکتے' یہاں پر دین کے غلبہ و اقامت کی کوئی جدّوجہد نہیں کر رہے' ہمارے ہاں کفر کا نظام چل رہا ہے۔ اس کے مخاطب اہل ایمان ہیں' اور اہل ایمان کا فرض یہ ہے کہ پہلے اپنے گھر کو درست کریں' پہلے اپنے ملک کے اندر اسلام قائم کریں۔ لہٰذا جہاد کرنا ہے تو یہاں کرو' جانیں دینی ہیں تو یہاں دو۔ یہاں پر طاغوت کی حکومت ہے' غیر اللہ کی حکومت ہے' قرآن کے سوا کوئی اور قانون چل رہا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (المائدۃ) ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں ...... وہی تو ظالم ہیں ...... وہی تو فاسق

ہیں۔" چنانچہ کافر‘ ظالم اور فاسق تو ہم خود ہیں۔ ہمیں پہلے اپنے گھر کی حالت درست کرنا ہوگی‘ اس کے بعد ایک جمعیت قائم ہوگی۔ ہماری حکومت تو ان لوگوں سے دوستیاں کرتی پھرتی ہے جن کے خلاف یہاں جہاد کا نعرہ بلند ہو رہا ہے‘ جس میں جانیں دی جا رہی ہیں۔ تو یہ آیت اپنی جگہ ہے۔ ہر چیز کو اس کے سیاق و سباق کے اندر رکھنا چاہیے۔

آیت ۷۶ ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ﴾ "جو لوگ ایمان والے ہیں وہ قتال کرتے ہیں اللہ کی راہ میں۔"

﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ﴾ "اور جو لوگ کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں قتال کر رہے ہیں"

جنگ تو وہ بھی کر رہے ہیں‘ جانیں وہ بھی دے رہے ہیں۔ ابوجہل بھی تو لشکر لے کر آیا تھا۔ ان کی ساری جدّوجہد طاغوت کی راہ میں ہے۔

﴿فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ﴾ "تو تم جنگ کرو شیطان کے ساتھیوں سے۔"

تم شیطان کے حمایتیوں سے‘ حزب الشیطان سے قتال کرو۔

﴿اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾﴾ "یقیناً شیطان کی چال بڑی کمزور ہے۔"

شیطان کی چال بظاہر بڑی زوردار اور بارعب دکھائی دیتی ہے‘ لیکن جب مردِ مؤمن اس کے مقابل کھڑے ہو جائیں تو پھر معلوم ہو جاتا ہے کہ بڑی بودی اور پھسپھسی چال ہے۔

آیات ۷۷ تا ۸۷

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۚ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی ۟ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۷﴾ اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ۚ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِکَ ؕ قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ

اللّٰهِ ۭ فَمَا لِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿٧٨﴾ مَآ اَصَابَكَ
مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ
لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٧٩﴾ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ
اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ
فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ
يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
وَكِيْلًا ﴿٨١﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا
فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾ وَاِذَا جَاۗءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا
بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ
يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ
اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٣﴾ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا
وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿٨٤﴾ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ
وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ
شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿٨٥﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ
اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿٨٦﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿٨٧﴾ ع

آیت ۷۷ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ﴾ ''تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟''

مکہ مکرمہ میں بارہ برس تک مسلمانوں کو یہی حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔ اس دور میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے' انہیں بہت بری طرح ستایا جا رہا تھا' تشدد و تعذیب کی نئی تاریخ رقم کی جا رہی تھی۔ اس پر مسلمانوں کا خون کھولتا تھا اور بہت سے مسلمان یہ

چاہتے تھے کہ ہمیں اجازت دی جائے تو ہم اپنے بھائیوں پر ہونے والے اس ظلم و ستم کا بدلہ لیں' آخر ہم نامرد نہیں ہیں' بے غیرت نہیں ہیں' بزدل نہیں ہیں۔ لیکن انہیں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ منہجِ انقلابِ نبویؐ کا ''صبرِ محض'' کا مرحلہ تھا۔ اُس وقت حکم یہ تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو۔ ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

ایک وقت آئے گا کہ تمہارے ہاتھ کھول دیے جائیں گے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ میں ''قِيْلَ'' فعل مجہول ہے۔ یہ کہا کس نے تھا؟ مکی قرآن میں تو ''كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ'' کا حکم موجود نہیں ہے۔ یہ حکم تھا محمد رسول اللہ ﷺ کا۔ حضور ﷺ نے اہل ایمان کو ہاتھ اٹھانے سے روکا تھا۔ یہ آیت سورۃ النساء میں نازل ہو رہی ہے جو مدنی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اُس وقت بھی وہ رسول اللہ ﷺ کا حکم تھا' جس کو اللہ نے اپنا حکم قرار دیا۔ گویا یہ حکم اللہ ہی کی طرف سے تھا۔ وحی جلی تو یہ قرآن ہے۔ اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ پر وحی خفی بھی نازل ہوتی تھی۔ تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکی دور میں وحی خفی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا ہو جو یہاں نقل ہوا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کا اپنا اجتہاد ہو جسے اللہ نے برقرار رکھا ہو' اسے قبول (own) کیا ہو۔

اب یہ بات یہاں محذوف ہے کہ اُس وقت تو کچھ لوگ بڑے جوش و جذبہ سے اور بڑے زور شور سے کہتے تھے کہ ہمیں اجازت ہونی چاہیے کہ ہم جنگ کریں' لیکن اب کیا حال ہوا:

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً﴾ ''تو جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اس طرح ڈر رہے ہیں جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے' بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈر رہے ہیں۔''

ظاہر بات ہے کہ یہ مکہ کے مہاجرین نہیں تھے' بلکہ یہ حال منافقینِ مدینہ کا تھا' لیکن فرق و تفاوت واضح کرنے کے لیے مکی دور کی کیفیت سے تقابل کیا گیا کہ اصل ایمان تو وہ تھا' اور یہ جو صورتِ حال ہے یہ کمزوریٔ ایمان اور نفاق کی علامت ہے۔

﴿وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں پروردگار! تو نے

ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی؟''

﴿لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ﴾ ''کیوں نہ ابھی ہمیں کچھ اور مہلت دی؟''

اس حکم کو کچھ دیر کے لیے مزید مؤخر کیوں نہ کیا؟

﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ﴾ ''(اے نبی!) کہہ دیجیے دنیا کا ساز و سامان بہت تھوڑا ہے۔''

﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۠﴾ ''اور آخرت بہت بہتر ہے اس کے لیے جو تقویٰ کی روش اختیار کرے۔''

﴿وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴾ ''اور تم پر ایک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔''

تمہاری حق تلفی قطعاً نہیں ہوگی اور تمہارے جو بھی اعمال ہیں' انفاق ہے' قتال ہے' اللہ کی راہ میں ایثار ہے' اس کا تمہیں بھرپور اجر و ثواب دے دیا جائے گا۔

آیت ۷۸ ﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ﴾ ''تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تم کو پالے گی''

ظاہر ہے قتال سے جی چرانے کا اصل سبب موت کا خوف تھا۔ چنانچہ ان کے دلوں کے اندر جو خوف تھا اسے ظاہر کیا جا رہا ہے۔ ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ موت سے کوئی مفر نہیں' تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمہیں پالے گی۔

﴿وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ﴾ ''خواہ تم بڑے مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔''

اگر چہ تم بہت مضبوط (fortified) قلعوں کے اندر اپنے آپ کو محصور کر لو پھر بھی موت سے نہیں بچ سکتے۔

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اور اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔''

منافقین کا ایک طرزِ عمل یہ بھی تھا کہ اگر مسلمانوں کو کوئی کامیابی حاصل ہو جاتی' فتح نصیب ہو جاتی' کوئی اور بھلائی پہنچ جاتی' حضورﷺ کی تدبیر کے اچھے نتائج نکل آتے تو اسے حضورﷺ کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے' بلکہ کہتے تھے کہ یہ اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے' یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ﴾ ''اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچ جائے تو کہتے ہیں کہ (اے محمدﷺ) یہ آپ کی وجہ سے ہے۔''

آپؐ نے یہ غلط اقدام کیا تو اس کے نتیجے میں ہم پر یہ مصیبت آ گئی۔ یہ آپؐ کا فیصلہ تھا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کریں گے' ہم نے تو آپؐ کو مشورہ دیا تھا کہ مدینے کے اندر محصور ہو کر جنگ کریں۔

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔''

یہ سب چیزیں' خیر ہو' شر ہو' تکلیف ہو' آسانی ہو' مشکل ہو' جو بھی صورتیں ہیں سب اللہ کی طرف سے ہیں۔

﴿فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝﴾ ''تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات بھی نہیں سمجھتے!''

آیت ۷۹ ﴿مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ؗ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ﴾ ''(اے مسلمان!) تجھے جو بھلائی بھی پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے پہنچتی ہے' اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ خود تیرے نفس کی طرف سے ہے۔''

ان آیات کے بارے میں مفسرین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ یہاں تحویلِ خطاب ہے۔ پہلی آیت میں خطاب ان مسلمانوں کو ہے جن کی طرف سے کمزوری یا نفاق کا اظہار ہو رہا تھا' لیکن اس آیت میں بحیثیتِ مجموعی خطاب ہے کہ دیکھو اے مسلمانو! جو بھی کوئی خیر تمہیں ملتا ہے اس پر تمہیں یہی کہنا چاہیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور کوئی شر پہنچ جائے تو اسے اپنے کسب وعمل کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ خیر بھی اللہ کی طرف سے ہے اور شر بھی۔ ''ایمانِ مفصل'' میں الفاظ آتے ہیں: ''وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی'' لیکن ایک مسلمان کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ خیر ملے تو اسے اللہ کا فضل سمجھے اور اگر کوئی خرابی ہو جائے تو سمجھے کہ یہ میری کسی غلطی کے سبب ہوئی ہے' مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے' جس پر اللہ تعالیٰ نے کوئی تادیب فرمانی چاہی ہے۔

﴿وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ﴾ ''اور (اے نبیؐ) ہم نے آپ کو تو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔''

اس مقام کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ درمیانی ٹکڑے میں بھی خطاب تو رسول

اللہ ﷺ ہی سے ہے' لیکن استعجاب کے انداز میں کہ اچھا! جو کچھ انہیں خیر مل جائے وہ تو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی آ جائے تو وہ آپ کی طرف سے ہے! یعنی یہ کیا بات کہہ رہے ہیں! جبکہ اللہ نے تو آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس کی یہ دو تعبیریں ہیں۔ میرے نزدیک پہلی تعبیر راجح ہے۔

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴿۷۹﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کافی ہے گواہ کے طور پر۔''

آیت ۸۰ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ''جس نے اطاعت کی رسول کی اُس نے اطاعت کی اللہ کی۔''

یہ ٹکڑا بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ یہ دوٹوک انداز میں واضح کر رہا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے یہ حدیث ملاحظہ کیجیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ' وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ 'وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ ' وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ))(۱)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کردہ) امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے (مقرر کردہ) امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔''

رسول اللہ ﷺ کی ساری جدوجہد جماعتی نظم کے تحت ہو رہی تھی۔ جہاد و قتال کے لیے فوج تیار ہوتی تو اس میں اوپر سے نیچے تک سمع و طاعت کی ایک زنجیر بنتی چلی جاتی۔ رسول اللہ ﷺ کمانڈر انچیف تھے' آپؐ لشکر کے میمنہ' میسرہ' قلب اور عقب وغیرہ پر' نیز ہراول دستے پر الگ الگ کمانڈر مقرر فرماتے۔ ان امراء کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب قول اللّٰہ تعالٰی واطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب اطاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمھا فی المعصیۃ۔

﴿وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾﴾ ''اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے آپؐ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے۔''

اے نبیؐ! ہم نے آپ کو ان پر داروغہ مقرر نہیں کیا۔ اپنے طرزِ عمل کے یہ خود ذمہ دار اور جواب دہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر یہ اُس کے محاسبے کا خود سامنا کریں گے۔

آیت ۸۱ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ﴾ ''اور کہتے ہیں کہ سرِ تسلیم خم ہے''

ان منافقوں کا حال یہ ہے کہ آپؐ کے سامنے تو کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں' آپؐ نے جو فرمایا قبول ہے' ہم اس پر عمل کریں گے۔

﴿فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ﴾ ''پھر جب آپ کے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ آپس میں ایسے مشورے کرتا ہے جو ان کے اپنے قول کے خلاف ہے۔''

آپؐ کے سامنے اطاعت کا اقرار کرتے ہیں' لیکن بعد میں جا کر ریشہ دوانیاں اور سازشیں شروع کر دیتے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ﴾ ''اور اللہ لکھ رہا ہے جو بھی وہ مشورے کرتے ہیں''۔

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ ''تو (اے نبیؐ) آپ ان سے چشم پوشی کیجیے''

آپ ان کی پروا نہ کیجیے' یہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ ابھی ان کے خلاف اقدام کرنا خلافِ مصلحت ہے۔ جیسے ایک دور میں فرمایا گیا: ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ (البقرۃ: ۱۰۹) یعنی ان یہودیوں کو ذرا نظر انداز کیجیے' ابھی ان کی شرارتوں پر نکیر نہ کیجیے' جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے' اس لیے کہ مصلحت کا تقاضا ہے کہ ابھی یہ محاذ نہ کھولا جائے۔ اسی طرح یہاں منافقین کے بارے میں کہا گیا کہ ابھی ان سے اعراض کیجیے۔ چنانچہ ان کی ریشہ دوانیوں سے کچھ عرصے تک چشم پوشی کی گئی اور پھر غزوۂ تبوک کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان پر گرفت شروع کی۔ پھر وہ وقت آ گیا کہ اب تک ان کی شرارتوں پر جو پردے پڑے رہے تھے وہ پردے اٹھا دیے گئے۔

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور آپ اللہ پر توکل کیجیے۔''

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾﴾ ''اور اللہ کافی ہے بھروسے کے لیے۔''

آپؐ کو سہارے کے لیے اللہ کافی ہے۔ان کی ساری ریشہ دوانیاں‘ یہ مشورے‘ یہ سازشیں‘ سب بادِ ہوا ہو جائیں گی‘ آپ فکر نہ کیجیے۔

آیت ۸۲ ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴾ ''کیا یہ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟''

یہ قرآن پڑھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں‘ لیکن اس پر غور و فکر نہیں کرتے۔ نمازیں تو وہ پڑھتے تھے۔ اُس وقت جو بھی منافق تھا اسے نماز تو پڑھنی پڑتی تھی‘ ورنہ اس کو مسلمان نہ مانا جاتا۔ آج تو مسلمان مانے جانے کے لیے نماز ضروری نہیں ہے‘ اُس وقت ضروری تھی۔ بلکہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی تو پہلی صف میں ہوتا تھا اور جمعہ کے روز تو خاص طور پر خطبے سے پہلے کھڑے ہو کر اعلان کرتا تھا کہ لوگو ان کی بات توجہ سے سنو‘ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ گویا اپنی چودھراہٹ کے اظہار کے لیے یہ انداز اختیار کرتا۔ تو وہ نمازیں پڑھتے تھے‘ قرآن سنتے تھے‘ لیکن قرآن پر تدبر نہیں کرتے تھے۔ قرآن ان کے سروں کے اوپر سے گزر رہا تھا یا ان کے ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے کان سے نکل جاتا تھا۔

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝﴾ ''اور اگر یہ اللہ کے سوائے کسی اور کے پاس سے آیا ہوتا تو اس میں وہ بہت سے تضادات پاتے۔''

اس پر غور کرو‘ یہ بہت مربوط کلام ہے۔ اس کا پورا فلسفہ منطقی طور پر بہت مربوط ہے‘ اس کے اندر کہیں کوئی تضاد نہیں ہے۔

آیت ۸۳ ﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ﴾ ''اور جب ان کے پاس کوئی خبر پہنچتی ہے امن کی یا خطرے کی تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں۔''

منافقین کی ایک روش یہ بھی تھی کہ جوں ہی کوئی اطمینان بخش یا خطرناک خبر سن پاتے اُسے لے کر پھیلا دیتے۔ کہیں سے خبر آ گئی کہ فلاں قبیلہ چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہا ہے‘ اس کی طرف سے حملے کا اندیشہ ہے تو وہ فوراً اسے عام کر دیتے‘ تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہو جائے۔ ''اِذَاعَة'' کا لفظ آج کل نشریاتی (broadcasting) اداروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ''مِذْیَاع'' ریڈیو سیٹ کو کہا جاتا ہے۔

﴿وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ﴾ ''اور اگر وہ اس کو رسولؐ اور اپنے اولوالامر کے سامنے پیش کرتے''

﴿لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ﴾ ''تو یہ بات ان میں سے ان لوگوں کے علم میں آ جاتی جو بات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں۔''

اگر یہ لوگ ایسی خبروں کو رسول اللہ ﷺ تک یا ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے' مثلاً اوس کے سردار سعد بن عبادہ ؓ اور خزرج کے سردار سعد بن معاذ ؓ وغیرہ' تو یہ ان کی تحقیق کر لیتے کہ بات کس حد تک درست ہے اور اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے اور پھر جائزہ لیتے کہ ہمیں اس ضمن میں کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ لیکن ان کی روش یہ تھی کہ محض سنسنی پھیلانے اور سراسیمگی پیدا کرنے کے لیے ایسی خبریں لوگوں میں عام کر دیتے۔

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ﴾ ''اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی''

﴿لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۳﴾ ''تو تم سب کے سب شیطان کی پیروی کرتے' سوائے چند ایک کے۔''

آیت ۸۴ ﴿فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''پس (اے نبیؐ!) آپ جنگ کریں اللہ کی راہ میں!''

قتال کے ضمن میں یہ قرآن مجید کی غالباً سخت ترین آیت ہے' لیکن اس میں سختی لفظی نہیں' معنوی ہے۔

﴿لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ﴾ ''آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے سوائے اپنی ذات کے''

﴿وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ﴾ ''البتہ اہل ایمان کو آپ اس کے لیے اُکسائیں۔''

آپؐ اہلِ ایمان کو قتال فی سبیل اللہ کے لیے جس قدر ترغیب و تشویق دے سکتے ہیں' دیجیے۔ انہیں اس کے لیے جوش دلائیے' اُبھاریے۔ لیکن اگر کوئی اور نہیں نکلتا تو اکیلے نکلیے۔ جیسے حضرت ابوبکر ؓ کا قول بھی نقل ہوا ہے' جب ان سے کہا گیا کہ مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں نرمی کیجیے تو آپؓ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔ عزیمت کا یہ عالم ہے! تو اے نبیؐ آپ کو تو یہ کام کرنا ہے' آپ کا تو یہ فرضِ منصبی ہے۔ آپ کو ہم نے بھیجا ہی اس لیے ہے کہ روئے ارضی پر اللہ کے دین کو غالب کر دیں۔

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ﴾ ''بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ جلد ہی ان کافروں کی قوت کو روک دے۔''

کُفّار و مشرکین کی جو جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں' بڑی چلت پھرت ہو رہی ہے' یہ تو کچھ عرصے کی بات ہے۔ وہ وقت بس آیا چاہتا ہے کہ ان میں دم نہیں رہے گا کہ آپ کا مقابلہ کریں۔ اور وہ وقت جلد ہی آ گیا کہ مشرکین کی کمر ٹوٹ گئی۔ سورۃ النساء کی یہ آیت ۴ ہجری میں نازل ہوئی اور ۵ ہجری میں غزوۂ احزاب پیش آیا' جس کے بعد محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ ایمان سے فرمایا کہ ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ))(۱) ''اس سال کے بعد قریش تم پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کریں گے' بلکہ اب تم ان پر حملہ آور ہو گے''۔ غزوۂ احزاب کے فوراً بعد سورۃ الصّف نازل ہوئی' جس میں اہلِ ایمان کو فتح و نصرت کی بشارت دی گئی: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾ اس سے اگلے سال ۶ ہجری میں آپ ﷺ نے عمرے کا سفر کیا' جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ ہو گئی' جسے اللہ تعالیٰ نے فتح مبین قرار دیا ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱﴾ (الفتح) اس کے بعد ساتویں سال میں اللہ تعالیٰ نے فتح خیبر عطا فرما دی اور آٹھویں سال میں مکہ فتح ہو گیا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک' سارے بند دروازے کھلتے چلے گئے۔

﴿وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝۸۴﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بہت شدید ہے قوت میں بھی اور سزا دینے میں بھی۔''

منافقین سے خطاب کے بعد اب پھر کچھ تمدنی آداب کا ذکر ہو رہا ہے۔ منافقین سے خطاب میں دو باتوں کو نمایاں کیا گیا۔ ایک اطاعتِ رسولؐ جو ان پر بہت شاق گزرتی تھی اور ایک قتال فی سبیل اللہ جو ان کے لیے بہت بڑا امتحان بن جاتا تھا۔ اب پھر اہلِ ایمان سے خطاب آ رہا ہے۔

آیت ۸۵ ﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ﴾ ''جو کوئی سفارش کرے گا بھلائی کی اُسے اس میں سے حصہ ملے گا۔''

انسانی معاشرے کے اندر کسی کے لیے سفارش کرنا بھی بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ آپ کے آس پاس کوئی شخص ہے' اس کی کوئی احتیاج ہے' آپ جانتے ہیں کہ صحیح آدمی ہے' بہروپیا نہیں ہے۔ دوسرے شخص کو آپ جانتے ہیں کہ وہ اس کی مدد کر سکتا ہے تو آپ کو دوسرے شخص کے پاس جا کر اس کے حق میں سفارش کرنی چاہیے کہ میں اس کو جانتا ہوں' یہ

(۱) تفسیر ابن کثیر ۳۹۶/۶۔ بروایت محمد بن اسحاق

واقعتاً ضرورت مند ہے۔اس طرح اُس کی ضرورت پوری ہو جائے گی اوراس نیکی کے ثواب میں آپ بھی حصہ دار ہوں گے۔اسی طرح کسی پر کوئی مقدمہ قائم ہوگیا ہےاورآپ کے علم میں اس کی بے گناہی کے بارے میں حقائق اورشواہد ہیں توآپ کوعدالت میں پیش ہوکر یہ حقائق اور شواہد پیش کرنے چاہئیں' تاکہ اس کی گلوخلاصی ہوسکے۔اس آیت کی رو سے نیکی' بھلائی' خیراور عدل وانصاف کی خاطر اگرکسی کی سفارش کی جائے تواللہ تعالیٰ اس کااجروثواب عطافرمائے گا۔

﴿وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا﴾ ''اور جو کوئی سفارش کرے گا برائی کی تواسے اس میں سے حصہ ملے گا۔''

کسی نے کسی کی جھوٹی اورغلط سفارش کی' حقائق کوتوڑامروڑا تو وہ بھی اس کے جرم میں شریک ہوگیااوروہ اس جرم کی سزامیں بھی حصہ دارہوگا۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا﴾ ''اوراللہ تعالیٰ ہر شے پر قوت رکھنے والا ہے۔''

آیت ۸۶ ﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا﴾ ''اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعادی جائے توتم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعادویااسی کولوٹادو۔''

ہر معاشرے میں کچھ ایسے دعائیہ کلمات رائج ہوتے ہیں جو معاشرے کے افراد باہمی ملاقات کے وقت استعمال کرتے ہیں۔جیسے مغربی معاشرے میں گڈ مارننگ اورگڈ ایوننگ وغیرہ۔ عربوں کے ہاں صباح الخیراور مساء الخیر کے علاوہ سب سے زیادہ رواج ''حَيَّاكَ اللّٰه'' کہنے کا تھا۔یعنی اللہ تمہاری زندگی بڑھائے۔جیسے ہمارے ہاں سرائیکی علاقے میں کہا جاتا ہے''حیاتی ہووے''۔ درازیٔ عمر کی اس دعا کو تَحِیَّہ کہا جاتا ہے۔سلام اوراس کے ہم معنی دوسرے دعائیہ کلمات بھی سب اس کے اندر شامل ہو جاتے ہیں۔عرب میں جب اسلامی معاشرہ وجود میں آیا تو دیگر دعائیہ کلمات بھی باقی رہے' البتہ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کوایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہوگئی۔اس آیت میں ہدایت کی جارہی ہے کہ جب تمہیں کوئی سلامتی کی دعا دے تو اس کے جواب کا اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ اس سے بہتر طریقے پر جواب دو۔''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کے جواب میں''وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ'' کے ساتھ''وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ'' کا اضافہ کر کے اسے لوٹائیں۔اگر یہ نہیں تو کم ازکم اسی کے الفاظ اس کی طرف لوٹادو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب

کرنے والا ہے۔''

یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جو ہیں انسانی زندگی میں ان کی بھی اہمیت ہے۔ ان معاشرتی آداب سے معاشرتی زندگی کے اندر حسن پیدا ہوتا ہے' آپس میں محبت و مودت پیدا ہوتی ہے۔

آیت ۸۷ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ﴾ ''اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

﴿لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ﴾ ''وہ تمہیں لازماً جمع کرے گا قیامت کے دن' جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔''

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴾ ''اور اللہ سے بڑھ کر اپنی بات میں سچا کون ہوگا؟''

منافقین پر جو تین چیزیں بہت شاق تھیں' اب ان میں سے تیسری چیز کا تذکرہ آ رہا ہے' یعنی ہجرت۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو بیمار تھے' بوڑھے تھے' سفر کے قابل نہیں تھے' یا عورتیں اور بچے تھے' ان کا معاملہ تو پہلے ذکر ہو چکا کہ ان کے لیے تمہیں قتال کرنا چاہیے تاکہ انہیں ظالموں کے چنگل سے چھڑاؤ۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان تو کر چکے تھے لیکن اپنے کافر قبیلوں اور اپنی بستیوں کے اندر آرام سے رہ رہے تھے اور ہجرت نہیں کر رہے تھے' جبکہ ہجرت اب فرض کر دی گئی تھی۔ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ ہجرت فرض کیوں کر دی گئی تھی؟ اس لیے کہ جب محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور تحریک اس مرحلے میں داخل ہوگئی کہ اب باطل کے خلاف اقدام کرنا ہے' تو اب اہل ایمان کی جتنی بھی دستیاب طاقت تھی اسے ایک مرکز پر مجتمع کرنا ضروری تھا' تاکہ پوری قوت کے ساتھ ایک جگہ سے فیصلہ کن اقدام کیا جا سکے۔ مکی دور میں جو پہلی ہجرت ہوئی تھی یعنی ہجرتِ حبشہ! وہ اختیاری تھی۔ اس کی صرف اجازت تھی' حکم نہیں تھا۔ لیکن ہجرتِ مدینہ کا تو حکم تھا۔ لہٰذا اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس بنا پر منافق قرار پائے کہ وہ ہجرت نہیں کر رہے ہیں۔

آیات ۸۸ تا ۹۱

﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا

تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ
اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ
يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾
سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا
اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ
وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ
جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ ﴾ ع

آیت ۸۸ ﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ﴾ ''پس تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو؟''

یہ بات آگے واضح ہو جائے گی کہ یہ کن منافقین کا تذکرہ ہے' جن کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان دو رائیں پائی جاتی تھیں۔ اہل ایمان میں سے بعض کا خیال تھا کہ ان کے ساتھ نرمی ہونی چاہیے' آخر یہ ایمان تو لائے تھے نا' اب ہجرت نہیں کر سکے۔ جبکہ کچھ لوگ اللہ کے حکم کے معاملے میں ان سے سخت رویہ اختیار کرنے کے حق میں تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان کے بارے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہو؟

﴿وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ﴾ ''اور اللہ نے تو ان کو ان کے کرتوتوں کے سبب الٹ دیا ہے۔''

ان کا ہجرت نہ کرنا درحقیقت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ الٹے پھیر دیے گئے ہیں۔ یعنی ان کا ایمان سلب ہو چکا ہے۔ ہاں کوئی مجبوری ہوتی' عذر ہوتا تو اور بات تھی۔

﴿اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ﴾ ''کیا تم چاہتے ہو کہ ان کو ہدایت دے دو جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے؟''

جن کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہر تصدیق ثبت ہو چکی ہے۔

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾﴾ ''اور جس کو اللہ راستے سے ہٹا دے اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہ پاؤ گے۔''

جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے آخری مہرِ تصدیق ثبت ہو چکی ہو اس کے لیے پھر کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے؟

آیت ۸۹ ﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً﴾ ''یہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جس طرح انہوں نے کفر کیا ہے تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ''

یہ لوگ جو ان کے بارے میں نرمی کی باتیں کر رہے ہیں' یہ چاہتے ہیں کہ جیسے انہوں نے کفر کیا ہے تم بھی کرو' تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ دُم کٹی بلی چاہتی ہے کہ سب بلّیوں کی دُمیں کٹ جائیں۔

﴿فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تو اب ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں اللہ کی راہ میں۔''

یہ گویا اب ان کے ایمان کا لٹمس (litmus) ٹیسٹ ہے۔ اگر وہ ہجرت نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مؤمن نہیں' منافق ہیں۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ ''اور اگر وہ پیٹھ موڑ لیں (ہجرت نہ کریں) تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ۔''

یعنی اگر وہ ہجرت نہیں کرتے جو ان پر فرض کر دی گئی ہے تو پھر وہ کافروں کے حکم میں ہیں' چاہے وہ کلمہ پڑھتے ہوں۔ تم انہیں جہاں بھی پاؤ پکڑو اور قتل کرو۔

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾﴾ ''اور ان میں سے کسی کو بھی اپنا ساتھی اور مددگار مت بناؤ۔''

آیت ۹۰ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ﴾ ''سوائے ان کے جن کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جس کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہے''

یعنی اس حکم سے صرف وہ منافقین مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسے قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں جس کے ساتھ تمہارا صلح کا معاہدہ ہے۔ اس معاہدے سے انہیں بھی تحفظ حاصل ہو جائے گا۔

﴿اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ﴾ ''یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ دل برداشتہ ہوں''

﴿اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ﴾ ''اس بات سے کہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے لڑیں۔''

یعنی ان میں اتنی جرأت نہیں رہی کہ وہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم کے خلاف لڑیں یا اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تمہارے خلاف لڑیں۔ انسانی معاشرے میں ہر سطح کے لوگ ہر دور میں رہے ہیں اور ہر دور میں رہیں گے۔ لہٰذا واضح کیا جا رہا ہے کہ انقلابی جدّوجہد کے دوران ہر طرح کے حالات آئیں گے اور ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ اس طرح کے کم ہمّت لوگ جو کہتے تھے کہ بھئی ہمارے لیے لڑنا بھڑنا مشکل ہے' نہ تو ہم اپنی قوم کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑیں گے اور نہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں گے' ان کے بارے میں بھی فرمایا کہ ان کی بھی جان بخشی کرو۔ چنانچہ ہجرت نہ کرنے والے منافقین کے بارے میں جو یہ حکم دیا گیا کہ ﴿فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ ''پس ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ'' اس سے دو استثناء بیان کر دیے گئے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلّط کر دیتا اور وہ تم سے لڑتے۔''

یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اللہ انہیں تمہارے خلاف ہمّت عطا کر دیتا اور وہ تمہارے خلاف قتال کرتے۔

﴿فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ﴾ ''پس اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش رہیں اور تم سے جنگ نہ کریں''

﴿وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ﴾ ''اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں''

﴿فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝﴾ ''تو اللہ نے تمہیں بھی ایسے لوگوں کے خلاف اقدام کرنے کی اجازت نہیں دی۔''

تو اس بات کو سمجھ لیجیے کہ جو منافق ہجرت نہیں کر رہے' ان کے لیے عام قاعدہ یہ ہے کہ اب ان کے خلاف اقدام ہوگا' انہیں جہاں بھی پاؤ پکڑو اور قتل کرو' وہ حربی کافروں کے حکم میں

ہیں۔ اِلّا یہ کہ (ا) ان کے قبیلے سے تمہارا صلح کا معاہدہ ہے تو وہ ان کو تحفظ فراہم کر جائے گا۔ (ب) وہ آ کر اگر یہ کہہ دیں کہ ہم بالکل غیر جانبدار ہو جاتے ہیں' ہم میں جنگ کی ہمت نہیں ہے' ہم نہ آپ کے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑ سکتے ہیں اور نہ ہی آپ کے خلاف اپنی قوم کی مدد کریں گے' تب بھی انہیں چھوڑ دو۔ اس کے بعد اب منافقین کے ایک تیسرے گروہ کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔

آیت ۹۱ ﴿سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ﴾ ''تم پاؤ گے ایک اور قسم کے لوگوں کو بھی جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں۔''

﴿كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا﴾ ''لیکن جب بھی فتنے کی طرف موڑے جاتے ہیں تو اس کے اندر اوندھے ہو جاتے ہیں۔''

جب بھی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس میں اوندھے منہ گرتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ اپنی قوم کا پلڑا بھاری ہے تو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ اب تو ہماری فتح ہونے والی ہے اور ہمیں مالِ غنیمت میں سے حصہ مل جائے گا۔

﴿فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ﴾ ''پس اگر یہ تم سے کنارہ کش نہ رہیں' تمہارے سامنے صلح و سلامتی پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں''

﴿فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ ''تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ۔''

﴿وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہیں سند (اور قوت) عطا کر دی ہے۔''

ایسے لوگوں کے معاملے میں ہم نے تمہیں کھلا اختیار دے دیا ہے کہ تم ان کے خلاف اقدام کر سکتے ہو۔ ○○

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

اسلام کے تصورِ توحید کی امتیازی حیثیت

عتیق الرحمٰن صدیقی

اسلام کے اعتقادی و عملی نظام میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل ہے' باقی تمام تر اعتقادات و ایمانیات' اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین اسی ایک اصل کی فرع ہیں۔ گویا اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے اس کا مصدر' مرجع' منبع اور ماخذ صرف خدا کی ذات ہے۔ انبیاء و رُسل' ملائکہ' کتب اور صحائف کی تقدیس و تحریم اسی ذاتِ گرامی کی رہینِ منت ہے۔ یہ عقیدہ جو اس عظیم الشان فکری و عملی نظام میں مرکز اور منبع قوت کا کام دے رہا ہے محض اسی قدر نہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے' بلکہ یہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور رکھتا ہے' اور اسی تصورِ صفات سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کی تمام فکری و عملی قوتوں پر محیط اور حکمران ہو جاتی ہے۔ محض ہستیٔ باری تعالیٰ وہ چیز نہیں ہے جسے اسلام کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکتا ہو۔ دوسری ملتوں نے بھی کسی نہ کسی طور پر باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات کیا ہے۔ البتہ جس چیز نے اسلام کو تمام مذاہب و ادیان سے ممتاز کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو صفاتِ باری تعالیٰ کا صحیح' مکمل اور مفصل علم بخشا ہے' اور پھر اسی علم کو ایمان بلکہ اصل ایمان کی بنا پر اس سے تزکیۂ نفس' اصلاحِ اخلاق' تنظیمِ اعمال' نشرِ خیر و منعِ شر اور بنائے تمدن کا اتنا بڑا کام لیا ہے جو دنیا کے کسی مذہب و ملت نے نہیں کیا۔

دخولِ اسلام کی پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کیا جائے کہ الٰہ بجز اس ایک ہستی کے اور کوئی نہیں جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ الوہیت کو کائنات کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لیے ثابت کیا جائے اور ان تمام جذبات' تخیلات' اعتقادات اور عبادات و طاعات کو جو الوہیت کے لیے مخصوص ہیں اسی ایک ذات سے متعلق کر دیا جائے۔ قرآن مجید نے الوہیت کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصور پیش کیا ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں

ملتا۔ دوسری قوموں اور ملّتوں میں یہ تصور کسی نہ کسی طرح موجود ہے لیکن ہر جگہ نامکمل یا غلط ہے۔ کہیں الوہیت نام ہے محض اوّلیت واجنبیت کا' کہیں اس سے محض مبدائیت مراد لی گئی ہے' کہیں اس کو قوت وطاقت کا ہم معنی سمجھا گیا ہے' کہیں وہ محض خوف اور ہیبت کی چیز ہے' کہیں وہ صرف محبت کا مرجع ہے' کہیں اس کا مفہوم محض دفعِ حاجات اور اجابتِ دعوات ہے۔ پھر وہ کہیں قابل تجزیہ وتقسیم ہے' کہیں اس کو تجسیم اور تشبیہہ وتناسل سے آلودہ کیا گیا ہے' کہیں وہ آسمانوں پر متمکن ہے اور کہیں وہ انسانی بھیس بدل کر زمین پر اُتر آئی ہے۔ ان تمام غلط یا ناقص تصورات کی تصحیح وتکمیل جس کتاب نے کی ہے وہ صرف قرآن حکیم ہے۔ اسی کتاب نے الوہیت کی تقدیس وتمجید کی ہے۔ اسی نے بتایا ہے کہ الٰہ صرف وہی ہوسکتا ہے جو بے نیاز' صمد اور قیوم ہو' قادر مطلق ہو' اس کا علم سب پر محیط ہو' نفع وضرر کا مالک ہو' اس کی صفات قابل تقسیم و تجزیہ نہ ہوں' تمام موجوداتِ عالم اسی کی محتاج ہوں۔

اس کے مقابلے میں خدا کو خدا کی صفتوں کو اور خدا وبندہ کے باہم تعلق کو واضح کرنے کے لیے خیالی یا مادی تشبیہیں اور تمثیلیں مذہب کے معتقدوں نے ایجاد کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل خدا تو جاتا رہا' اس کی جگہ تشبیہیں اور تمثیلیں خدا بن گئیں۔ آرین قوموں کے ہاں بھی یہی کچھ ہوا اور دوسرے ہندو فرقوں نے بھی خدا کو مختلف شکلوں میں پیش کیا۔ پیغامِ محمدیؐ نے ان تمام تشبیہی وتمثیلی صورتوں' طریقوں اور محاوروں کو یک قلم موقوف کردیا اور ان کا استعمال شرک قرار دیا۔ اس نے صاف اعلان کیا ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں''۔ قرآن حکیم کی ایک چھوٹی سی سورۃ ''سورۂ اخلاص'' میں توحید کی نکھری ہوئی حیثیت کو پیش کیا گیا۔

قدیم مذاہب کے عقیدۂ توحید میں صفات کے مسئلے کو عجیب انداز میں پیش کیا گیا۔ یعنی صفات کو ذات سے الگ مستقل وجود کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ ہندوؤں کے عام مذاہب میں جو خداؤں کا لاتعداد لشکر نظر آتا ہے وہ اسی غلطی کے سبب ہے۔ ہر صفت کو انہوں نے ایک علیحدہ اور مستقل وجود تسلیم کرلیا۔ اس طرح ایک خدا کے ۳۳ کروڑ خدا بن گئے۔ تعداد کو چھوڑ کر صفات کی تشبیہہ اور تمثیل انہوں نے مجسم کر کے پیش کی' اسی سے وہ مختلف فرقوں میں بٹے۔ خالقیت' قوتیت اور ممیت کو تین مستقل قسمیں تسلیم کرلیا۔ پھر یہ کہ حیات باپ ہے' علم روح القدس ہے اور ارادہ بیٹا۔ اسی قسم کی چیزیں رومی' یونانی' مصری تخیل میں بھی ملتی ہیں' مگر اسلام کے تصورِ توحید نے اسی غلطی کا پردہ چاک کیا اور صفات کی نیرنگی سے دھوکا کھا کر ایک کو چند سمجھنا انسان کی

جہالت و نادانی قرار دیا۔ قرآن نے کہا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سب خوبیاں اسی ایک پروردگار عالم کے لیے ہیں۔ ﴿لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ سب اچھی صفتیں اُسی کے لیے ہیں۔ ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اللہ ہی زمین و آسمان کا نور ہے۔ دوسری جگہ کہا وہی کام بنانے والا ہے‘ وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ پھر کہا وہی حکیم ہے‘ وہی علیم ہے اور سمیع و بصیر ہے۔

افعالِ الٰہی کی نیرنگی سے بھی لوگوں کو غلطی لگی‘ انہوں نے سمجھا کہ مختلف افعال کرنے والی مختلف ہستیاں ہیں‘ کوئی مارتی ہے‘ کوئی جلاتی ہے‘ کوئی لڑائی لڑواتی ہے‘ کوئی صلح کرواتی ہے‘ کسی کا کام محبت ہے‘ کسی کا عداوت ہے‘ کوئی علم کا دیوتا ہے‘ کوئی دولت کی دیوی ہے‘ غرضیکہ الگ الگ کام کے سینکڑوں خدا ہیں۔ اسلام نے ان نادانوں کو بتایا کہ یہ سب ایک ہی خدا کے کام ہیں۔ زردشتیوں نے اچھے کاموں کا الگ خدا تجویز کیا اور اس کا نام یزداں رکھا اور بُرے کاموں کے لیے جو خدا تجویز کیا اسے اہرمن ٹھہرایا —— اسلام میں کوئی شے اپنے اصل کے لحاظ سے نہ خیر ہے نہ شر۔ وہ خیر و شر انسانوں کے صحیح یا غلط استعمال سے بن جاتی ہے۔ آگ سے کھانا پکاؤ‘ ایندھن جلاؤ یا غریب کو تاپنے دو تو یہ خیر ہے‘ اور اگر اسی سے کسی غریب کا گھر جلا دو تو یہ شر ہے۔ آگ اپنی اصل کے لحاظ سے خیر ہے نہ شر‘ استعمال سے خیر بنے گی یا شر۔ دراصل یہ کائنات اور اس کی نیرنگیاں تمام تر اُسی ایک ذات کی پیدا کردہ ہیں اور انہیں دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام پکار اٹھتے ہیں:

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿٧٩﴾﴾ (الانعام)

’’میں نے اپنا منہ سب کی طرف سے پھیر کر اُس ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا‘ اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔‘‘

دوسری طرف اسی مادہ اور اس کی قوتوں اور خاصیتوں کی ظاہرداریوں میں پھنس کر انسان کے دل و دماغ کی عقل و حکمت خدا کا انکار کر بیٹھتی ہے اور مادہ ہی کو اصل کائنات اور علۃ العلل سمجھنے لگتی ہے اور یہ کہہ اٹھتی ہے:

﴿مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجاثیۃ: ۲۴)

’’اس دنیوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں‘ ہم (خود ہی) مرتے ہیں اور جیتے

ہیں اور ہم کو زمانے کے سوا اور کوئی نہیں مارتا۔"

کائنات اور اس کے عجائبات اور خواص ہر شخص کے سامنے ایک ہی ہیں' البتہ دماغ ہزاروں ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایک دماغ خدا پرست ہو جاتا ہے اور دوسرا گمراہ اور دہریہ بن جاتا ہے۔ اسلام میں وحدانیت کا امتیاز یہ ہے کہ وہ تمام نیرنگیوں کو ایک ہی قدرت کے تماشے قرار دیتی ہے' خیر و شر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں اور ہدایت و ضلالت دونوں ادھر ہی سے ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ﴾ (البقرة:٢٦) یعنی اپنے اس کلام کے ذریعے وہ بہتوں کو راہِ راست نہیں دکھاتا اور بہتوں کو راہِ راست دکھاتا ہے۔ مزید فرمایا کہ وہ عنادی کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ وہ فرماتا ہے کہ تمہارا اور ہر چیز کا رب وہی اللہ ہے جو خالق ہے' اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں' اُس نے ہر چیز کو اس کی صورت بخشی اور پھر ہدایت دی۔

خدا کی عبادت ہر مذہب میں تھی اور ہے۔ قدیم مذاہب میں ایک غلط فہمی پھیل گئی کہ عبادت کا مقصود جسم کو تکلیف دینا ہے اور یہ روحانی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہندوؤں میں جوگ اور عیسائیوں میں رہبانیت پیدا ہوئی۔ اسلام نے اس تصورِ عبادت کو غلط قرار دیا اور کہا: ﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ (البقرة:٢٨٦) "اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔" فرمایا: ﴿وَ رَهْبَانِیَّةَ ِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ﴾ (الحدید:٢٧) "اور رہبانیت کو انہوں نے دین میں داخل کر دیا' ہم نے ان پر اس کو فرض نہیں کیا تھا"۔ اسلام نے بتایا کہ عبادت یہی ہے کہ بندہ میں سرکشی نہ ہو اور وہ اپنے پروردگار کا اطاعت گزار اور فرمانبردار ہو۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (البقرة)

"اے لوگو تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔"

دوسرے مذاہب میں ایک عبادت قربانی کی بھی رہی ہے' مگر یہاں صورت حال یہ تھی کہ لوگ اپنے آپ کو دیوتاؤں پر قربان کر دیتے' اپنی اولاد کو اپنی ملکیت سمجھتے اور ان کو بھینٹ چڑھا دیتے تھے' دیوتاؤں کو خون کے چھینٹے دیے جاتے تھے' جو جانور قربانی کیے جاتے تھے ان کا گوشت جلایا جاتا تھا۔ یہودی اس لیے قربانی کے گوشت کو جلاتے۔ مگر حضور ﷺ نے آ کر

پروردگارِعالم کا یہ پیغام سنایا:

﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۚ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (الحج)

''اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کے نام کی نشانی بنایا ہے' تمہارے لیے ان قربانیوں میں بھلائی ہے' تم ان پر اللہ کا نام پڑھو قطار باندھ کر' اور جب وہ ذبح ہو چکیں تو ان میں سے کچھ تم خود کھاؤ اور باقی قانع و بے قرار غریبوں کو دو۔ اس طرح یہ جانور ہم نے تمہارے بس میں دے دیے ہیں تاکہ تم ہمارا شکر ادا کرو۔ ہرگز اللہ کو ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا لیکن تمہارے دل کا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔ اُس نے ان کو تمہارے لیے اس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو۔ اور (اے نبیؐ) احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دیجیے!)۔''

اسلام میں توحید کی انفرادی و تکمیلی اور امتیازی شان کی معرفت کے لیے ہم آخر میں رسول اکرم ﷺ کے ارشادات نقل کر رہے ہیں:

☆ حضرت انس ؓ کا بیان ہے کہ خیبر کے کچھ یہودی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اے ابوالقاسم اللہ نے ملائکہ کو نورِ حجاب سے' آدم کو مٹی کے سڑے ہوئے گارے سے' ابلیس کو آگ کے شعلے سے' آسمان کو دھوئیں سے اور زمین کو پانی کے جھاگ سے بنایا۔ اب ہمیں اپنے رب کے متعلق بتائیے (کہ وہ کس چیز سے بنا ہے)۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر جبرئیل آئے اور انہوں نے کہا اے محمدؐ ان سے کہیے هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ......

☆ ضحاک' قتادہ اور مقاتل کا بیان ہے کہ یہودیوں کے کچھ علماء حضور ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا: ''اے محمدؐ! اپنے رب کی کیفیت ہمیں بتایئے' شاید کہ ہم آپؐ پر ایمان لے آئیں' اللہ نے اپنی صفت تورات میں نازل کی ہے آپ بتایئے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ کس جنس

سے ہے؟ سونے سے بنا ہے یا تانبے سے یا پیتل سے یا لوہے سے یا چاندی سے؟ اور کیا وہ کھاتا پیتا ہے؟ اور کس سے اس نے دنیا وراثت میں پائی ہے اور اس کے بعد کون اس کا وارث ہوگا؟''
اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص نازل فرمائی۔ (تفسیر سورۂ اخلاص از ابن تیمیہؒ)

ایسی متعدد روایات ہیں۔ سب سے پہلے یہ سوال مکہ میں قریش کے مشرکین نے کیا اور اس کے بعد مدینہ طیبہ میں کچھ یہودیوں نے۔ کبھی عیسائیوں نے اور کبھی عرب کے دوسرے لوگوں نے حضورﷺ سے اس نوعیت کے سوالات کیے اور ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہوا کہ جواب میں یہ سورہ یعنی سورۂ اخلاص پڑھ کر سنا دیں۔ یہودیوں' عیسائیوں اور مشرکین قریش کے سوالات سے اُس وقت کے مذہبی تصورات پر روشنی پڑتی ہے۔ بت پرست مشرکین ان خداؤں کو پوج رہے تھے جو لکڑی' پتھر' سونے' چاندی وغیرہ اور مختلف چیزوں سے بنے ہوئے تھے' شکل و صورت اور جسم رکھتے تھے' دیویوں اور دیوتاؤں کی باقاعدہ نسل چلتی۔ مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے اور کچھ لوگ اس کے اوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ ایک خدا ماننے کے مدعی ہیں مگر ان کا خدا بھی کم از کم بیٹا تو رکھتا ہی تھا اور باپ بیٹے کے ساتھ خدائی میں روح القدس کو بھی حصہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حتیٰ کہ خدا کی ماں بھی ہوتی تھی اور اس کی ساس بھی۔ یہودی بھی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان کا خدا بھی مادیت اور دوسری انسانی صفات سے خالی نہ تھا۔ وہ ٹہلتا تھا' وہ انسانی شکل میں نمودار ہوتا تھا اور اپنے کسی بندے سے کشتی لڑ لیتا تھا اور ایک عدد بیٹے کا باپ بھی تھا۔ ان مذہبی گروہوں کے علاوہ مجوسی' آتش پرست اور صابی ستارہ پرست بھی تھے۔

اس حالت میں جب اللہ وحدہ لاشریک کو ماننے کی دعوت دی گئی تو ان کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کہ وہ رب ہے کس قسم کا جسے تمام ارباب اور معبودوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ہی رب اور معبود تسلیم کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے؟ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے سوالات کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا ایسا واضح تصور پیش کر دیا جو تمام مشرکانہ تصورات کا قلع قمع کرتا ہے اور اس کی ذات کے ساتھ مخلوقات کی صفات میں سے کسی صفت کی آلودگی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔ وہ فرماتا ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾

(باقی صفحہ 37 پر)

آزادی یا بندگی؟

محمد عمران صدیقی

آزادی کے مدِّمقابل یوں تو غلامی کا لفظ آتا ہے اور 'غلامی' کا مفہوم عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ کوئی انسان یا گروہ' قوم یا نسل کسی دوسرے انسان' گروہ' قوم یا نسل کے ہاتھوں غلام بنا دی جائے۔ ایسی غلامی کو اسلام نے محدود کیا اور اس کے لیے زبردست قسم کے قواعد و ضوابط عطا کیے۔ آج اس طرز کی جسمانی غلامی ظاہری طور پر ختم ہو جانے کے باوجود حقیقی اعتبار سے فکری' معاشی' سیاسی اور ثقافتی غلامی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یعنی حقیقتاً غلامی کا خاتمہ نہیں ہوا' بلکہ شکل تبدیل ہوئی ہے۔ لیکن یہ 'آزادی' اور 'غلامی' آج ہماری گفتگو کا موضوع نہیں۔ آج ہم جو بات کرنا چاہتے ہیں وہ ہے 'آزادی' اور 'بندگی' یعنی ایسی 'آزادی' جس کا مقابل 'غلامی' نہیں بلکہ 'بندگی' ہے۔ یا زیادہ واضح الفاظ میں ''بندگی رب'' اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی کا اقرار و اعتراف' جو اسلام کا سب سے پہلا سبق ہے۔ اس اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے اپنے تمام عقلی افکار' اپنے قلبی جذبات' اپنی سفلی خواہشات' اپنی بصارت' اپنی سماعت' اپنی گفتار اور اپنے کردار حتیٰ کہ پوری کی پوری زندگانی اور اپنی موت بھی' گویا اپنا سب کچھ' اس مالک کائنات کے سامنے تسلیم (surrender) کر دینا' جھکا دینا' اس کی مرضی کے تابع کر دینا' اس کی وحی' اس کے پیغمبرؐ اس کی کتاب کے بتائے ہوئے راستے پر چلا دینا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانعام)

''کہہ دیجیے کہ میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت ایک اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے''۔

اور پھر صرف اتنا ہی نہیں کہ اس مالکِ کائنات' خالقِ ارض و سماوات' اللہ ربّ العالمین کی بندگی اختیار کرنا ہے' بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے' یا یوں کہیں کہ ایک قدم پہلے' بندگی رب کے علاوہ ہر قسم کی بندگی سے انکار کرنا ہے' ہر قسم کی بندگی کرانے والے جھوٹے معبودوں کی

عبادت کا کفر کرنا ہے۔ عبادت کا تعلق خواہ قلبِ انسانی سے ہو یعنی محبت‘ خوف و اُمید ورجا‘ بھروسہ وتوکّل یا اعضاء وجوارح سے ہو مثلاً دُعاو نِدا‘ رکوع وسجدہ‘ طواف واعتکاف‘ قربانی و ذبیحہ یا قوانین اور ضابطوں سے ہو‘ معاشرتی‘ معاشی یا سیاسی قواعد وضوابط ہوں‘ جس کے مانے جائیں گے اس کی بندگی ہوگی۔ اور اسلام ہمیں ان تمام عبادات‘ چاہے وہ قلبی ہوں‘ اعضاء و جوارح سے متعلق ہوں یا اطاعت سے‘ صرف ایک اللہ ربّ العالمین کے لیے خاص کرنے اور باقی تمام جھوٹے معبودوں (طاغوت) سے بندگی کا انکار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد یہی بتایا ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾

(النحل:٣٦)

’’اور ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا (تاکہ دعوت دے) کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (کی بندگی) سے بچو۔‘‘

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ (البقرة:٢٥٦)

’’جس شخص نے طاغوت کا کفر کیا اور اللہ پر ایمان لایا اُس نے مضبوط سہارا تھام لیا‘ جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔‘‘

بلکہ مسلمان ہونے کے لیے ہم جس کلمہ کا اقرار کرتے ہیں‘ تمام انبیاء جس کی تعلیم دیتے رہے: ’’لا الٰہ الا اللہ‘‘ اس کے معنی ہی یہی ہیں کہ ’’کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے‘‘۔ یوں مسلمان ہونے کے لیے جو سب سے پہلی اور اہم ترین بات ضروری ہے وہ ہے بندگی اور عبادت کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر دینا۔ اپنی نفسانی خواہشات‘ اپنے خام عقلی توہمات ومفروضات‘ اپنے جیسے انسانوں یا اپنے سے گئے گزرے جمادات‘ آگ‘ سورج‘ چاند ستاروں‘ یا حیوانات ونباتات وغیرہ یا جنّات‘ فرشتوں اور نبیوں کی عبادت وبندگی کا انکار۔

بندگی کے مقابلے میں آج کی جدید جاہلیت ’آزادی‘ کا نعرہ بلند کرتی ہے۔ جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا ’آزادی‘ سے ان کی مراد ’غلامی‘ سے آزادی نہیں بلکہ وہ ’بندگی‘ سے آزادی چاہتے ہیں۔ ’محبت‘ کے نفیس اور اعلیٰ جذبات اللہ ربّ العالمین کے لیے خاص کرنے کی بجائے عورت‘ دولت‘ شہرت پر بلکہ قوم اور رنگ ونسل پر نچھاور کرتے ہیں۔ قیام‘ رکوع‘ سجدہ‘ ذبیحہ‘

دُعاونِداہر سچے جھوٹے معبود کے لیے روا رکھتے ہیں۔ قانون بنانے کا حق اللہ مالک الملک کی بجائے خواہشات وتوہمات کے بندوں کی اکثریت کا مانتے ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ کی بندگی سے فرار اور انسان کی الوہیت کا اقرار 'آزادی' کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحی' کلام اللہ اور کتاب اللہ کی حکمرانی اور پیغمبروں کی اطاعت وفرمانبرداری سے اعراض اور خواہشات وتوہمات' شہوات وشبہات اور نفس وگمان کی پیروی کو 'آزادی' کہتے ہیں۔ اسی لیے آج کی جدید جاہلیت کا کلمہ لا الٰہ الا الانسان (Man is the master of the universe) ہے۔

اسلام اس 'الوہیتِ انسانی' یا 'حاکمیتِ جمہور' کو خواہشاتِ نفسانی اور شہواتِ انسانی کی غلامی وبندگی قرار دیتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾﴾ (الفرقان)

''آپ نے اسے بھی دیکھا جو اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے؟ کیا آپ اس کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟''

یوں انسان 'آفاق' میں پھیلے بتوں کی پرستش سے ہزار کوشش کے بعد کسی حد تک چھٹکارا پا بھی سکے تو 'انفس' میں چھپے بتوں کی پرستش پر مائل ہو جاتا ہے۔ 'عبادت' اور 'بندگی' تو بھوک اور پیاس سے بھی پہلے انسانی فطرت ہے۔ اس سے 'آزاد' ہو کر تو کوئی انسان جی نہیں سکتا ہے۔ سچے معبود کی پہچان نہ ہو تو بندگی کے نفیس جذبات' پرستش کے افعال اور اطاعت...... آدمی جھوٹے معبودوں کے چرنوں میں ڈھیر کر دیتا ہے۔ 'بندہ' کو بندگی ہی کرنا ہے' حقیقی معبود کی کرے یا من گھڑت معبود تراشے۔

اسلام انسانوں کو 'آزادی' نہیں 'بندگی' کا سبق دیتا ہے اور اللہ کے پیغمبر انسانوں کو جھوٹے معبودوں' طاغوتوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ خالقِ دو جہاں' مالکِ کائنات اور مدبر الامر' ربّ تعالیٰ کی بندگی کی طرف بلاتے ہیں۔ یہ فیصلہ ہمارا ہے کہ 'آزاد' رہنا ہے یا 'بندگی' اختیار کرنا ہے۔ پھر خالص اللہ کی بندگی اختیار کر کے موحد بننا ہے یا بندگی میں اللہ کا شریک ٹھہرا کر مشرک بننا ہے۔ جو فیصلہ ہم کریں گے' اس کے نتائج کے ذمہ دار ہوں گے' اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی!

فخرِ انسانیت' عبدِ کامل محمد رسول اللہ ﷺ اپنے ربّ کے حضور اپنی عبدیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ وَابْنُ عَبْدِکَ وَابْنُ اَمَتِکَ))

''اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں' تیرے بندے کا بیٹا اور تیری بندی کا بیٹا۔''

((نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُکَ)) (مسند احمد)

''میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے' تیرا حکم مجھ میں جاری ہے' میرے بارے میں تیرا فیصلہ عدل ہے۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو پیدا ہی اپنی بندگی کے لیے کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ (الذاریات)

''اور جنوں اور انسانوں کو میں نے صرف اسی لیے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں۔''

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء ورسل کو اسی مقصدِ حیات کی یاددہانی کے لیے مخلوق کی طرف بھیجا۔ ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے شاہِ رستم کے دربار میں اپنی دعوت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

اَللّٰہُ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ عَنْ عِبَادَۃِ الْعِبَادِ اِلٰی عِبَادَۃِ اللّٰہِ وَحْدَہٗ وَمِنْ ضِیْقِ الدُّنْیَا اِلٰی سِعَۃِ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ وَمِنْ جَوْرِ الْاَدْیَانِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ (۱)

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھیجا ہے کہ ہم نکالیں انسانوں کو بندوں کی بندگی سے اکیلے اللہ کی بندگی کی طرف' دنیا کی تنگنائیوں سے دنیا وآخرت کی وسعت کی طرف اور ادیان کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف۔''

'آزادی' کا نعرہ درحقیقت ایک دھوکہ ہے' فریب ہے' دجل ہے' جو انسانوں کو ایک گمراہی سے نکال کر دوسری ظلمت میں پھینک دیتا ہے۔ قدیم جاہلیت سے جدید جاہلیت کی طرف' اللہ تعالیٰ کی بندگی سے خواہشاتِ نفس کی بندگی میں لے جاتا ہے۔ العلم اور الروح یعنی وحی الٰہی کی پیروی اور اتباع سے نکال کر ظن وگمان اور توہمات ومفروضات کی پیروی' عقلِ انسانی' کثرتِ رائے اور انسانی حقوق کے خوبصورت پردوں میں کرواتا ہے۔

اوپر ذکر کیے گئے صحابیِ رسولؐ کے قول پر ذرا دیر کے لیے رکیے اور غور کیجیے۔ فرماتے ہیں کہ ہم بندگانِ خدا کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی میں لانا چاہتے ہیں۔

---

(۱) قواعد المنہج السلفی فی الفکر الاسلامی (بحوث فی العقیدۃ الاسلامیۃ) مصنف دکتور مصطفی حلمی' دار الکتب العلمیۃ ۲۰۰۵م' ص ۱۷۷ بحوالہ نظام الاسلام: العقیدۃ والعبادۃ' مصنف محمد المبارک' دار الفکر ۱۹۸۳م ص ۱۹ تا ۲۱۔

انسانیت کی اکثریت عام طور پر ماضی میں بھی اور حال میں بھی اپنے جیسے بندوں کی بندگی میں رہی ہے۔ کبھی پیر‘ پروہت‘ پادری اور پنڈت اپنی پوجا کراتے‘ کبھی بادشاہ‘ سردار‘ احبار ور ہبان اپنے حکم کے سامنے لوگوں کے سر جھکاتے رہے اور آج کی جدید جاہلیت اکثریت‘ جمہوریت‘ سائنس‘ عقل‘ عالمی اداروں اور سوشل سائنسز کے نام پر انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کے اہواء وظنون کا جوا اپنی گردنوں میں ڈالنے پر مجبور کر رہے ہیں اور اس کی طرف راغب کر رہے ہیں‘ اور پھر اس کو آزادی کا نام دیتے ہیں: آزادیٔ افکار‘ آزادیٔ اظہارِ رائے‘ آزادیٔ نسواں‘ آزادیٔ قوم وملک۔

اسلام ان انسانی خواہشات اور توہمات کو‘ خواہ وہ آباء واجداد کی روایاتِ رسوم ورواج پر مبنی ہوں یا فلاسفہ ومفکرین اور ماہرینِ مذاہب کے خیالات پر مشتمل ہوں‘ العلم اور الروح یعنی وحی الٰہی کی میزان میں تولتا ہے۔ جو بات وحیٔ الٰہی‘ کلامِ الٰہی‘ یا سنّتِ نبویؐ سے اخذ ہو یا اجماع اور قیاس سے حاصل کی جائے یا پھر میزان میں پوری اترتی ہو‘ وہی قابلِ قبول ہوگی اور باقی سب ردّ اور مردود۔

آباء واَجداد کی روایات ہوں یا مذہبی پروہتوں کی محرفات‘ نفسانی خواہشات کی خرافات ہوں یا خام عقلی تصورات ونظریات‘ انسان فردِ واحد ہو یا اکثریت کی پیروی‘ ان سب کو اسلام اِصر واغلال سے تعبیر کرتا ہے‘ اور انسانی قلب وعقل اور اجسام وارواح پر پڑے ان بوجھوں کو اتارنے پر اصرار کرتا ہے اور انسان کو زر‘ زن اور زمین کی محبت سے نکال کر زر‘ زن اور زمین کے خالق ومالک کی محبت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

یہاں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ جاہلیتِ جدیدہ کے ان اہواء وظنون کو بعض مسلمان دانشور اور مفکرین اسلام کے ساتھ جوڑنا شروع کر دیتے ہیں‘ مثلاً اسلام تو خود آزادی...... آزادیٔ فکر وعقیدہ‘ آزادیٔ اظہارِ رائے‘ آزادیٔ نسواں‘ آزادیٔ ملک وقوم کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ مگر حقیقت میں یا تو وہ خود التباس کا شکار ہوتے ہیں یا مسلمانوں کو خلطِ مبحث میں ڈال کر گمراہ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ جہاں تک بات ہے آزادیٔ فکر وعقیدہ کی‘ تو اس میں کیا شک ہے کہ اسلام ﴿لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ﴾ کی تعلیم دیتا ہے‘ لیکن ساتھ ہی قرآن اور پیغمبرﷺ اسلام‘ ایمان اور توحید کو ’الحق‘ قرار دیتے ہیں اور غیر اسلام کو کفر‘ شرک‘ ظلم اور باطل قرار دیتے ہیں۔ یوں دنیا میں انسان عقیدہ وفکر کی بنا پر دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں ’’اہلِ حق‘‘

اور ''اہلِ باطل'' اور آخرت میں بھی اسی بنا پر ''اہلِ جنت'' اور ''اہلِ دوزخ'' میں تقسیم ہوں گے۔ جبکہ جاہلیتِ جدیدہ کے نقیب آزادیٔ فکر وعقیدہ کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ ہر عقیدہ اختیار کرنا انسان کا بنیادی حق ہے' وہ اسلام کو مانے یا غیر اسلام کو' توحید کو قبول کرے یا شرک کو' مسجد بنائے یا مندر' بت کو پوجے یا صلیب کو' یا سرے سے کسی خدا اور اس کی بندگی کا منکر بن جائے' یہ سب ہی حق ہے اور انسان کا بنیادی حق۔ لہٰذا اس عقیدہ وفکر کی بنا پر انسانوں کی تقسیم 'ناحق' ہے' کوئی عقیدہ 'الحق' یا 'باطل' نہیں' سب ہی برابر ہیں۔ (مساوات کی قدر پر آئندہ کسی مجلس میں تفصیل سے بات کریں گے۔ ان شاءاللہ!)

'آزادیٔ اظہارِ رائے' کو بھی بعض لوگ اسلام کی دین اور عطا قرار دیتے ہیں کہ بھری مجلس میں ایک عام آدمی خلیفۃ المسلمین کا احتساب کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ توہینِ رسالت کے مجرم کی گردن اڑا دینا بھی اسلام کی تعلیم ہے' جبکہ خاکے بنانے والوں کے فعل کو آج کی جاہلیتِ جدیدہ 'آزادیٔ اظہارِ رائے' کا نام دیتی ہے۔ الفاظ ایک ہی ہوں تب بھی معنی مختلف ہو سکتے ہیں۔

'آزادیٔ نسواں' کا جاہلیتِ جدیدہ کی نظر میں مفہوم یہ ہے کہ عورت آزاد ہے' اپنی مرضی اور اپنے جسم کی خود مالک ہے' چاہے طوائف کا پیشہ اختیار کرے' ایک سے زیادہ مردوں سے جنسی تعلقات بیک وقت قائم رکھے۔ عورت' عورت سے شادی رچائے' سب کچھ قانونی ہے' جائز ہے' عورت کا بنیادی حق ہے اور آزادیٔ نسواں کی علامت ہے۔

اسلام 'بندگی' کا حکم دیتا ہے' مرد آزاد ہے نہ عورت۔ جسے الحق کی تلاش ہے وہ اپنے نفس کو اپنے رب کے سپرد کر دے' اپنی مرضی' خواہش' چاہت اور فکر کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے سامنے جھکا دے۔

'آزادیٔ قوم وملک' کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جس خطے پر جو قوم بستی ہے' وہ خطہ اسی قوم کی ملک ہے' وہاں اس کی منشا ومرضی چلے گی' وہاں کی اکثریت جو چاہے کر گزرے' البتہ یہ آزادی بھی بنیادی حقوق' اقوامِ متحدہ کے چارٹر وغیرہ کے ماتحت ہوگی۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فرد اپنے جسم اور قوم اپنے ملک کی خود مالک نہیں' بلکہ یہ اللہ کی امانت ہے' فرد اپنے جسم پر اللہ کا حکم جاری کرے گا اور قوم اپنے ملک پر خدا کی مرضی!

آزادی' بندگی کی ضد ہے' ہم مسلمان ہیں' آزاد نہیں۔ اپنے رب کے بندے ہیں' اللہ کو

رب مان کر خوش' محمد ﷺ کو نبی مان کر مطمئن اور اسلام کو دین جانتے ہوئے اطاعت گزار۔ ایک مسلمان کا 'ماٹو' یہی تو ہوتا ہے:

((رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا)) (مسلم والترمذی)

''میں راضی ہو گیا اللہ کو رب مان کر' محمد ﷺ کو رسول مان کر اور اسلام کو بطور دین قبول کر کے۔''

اور وہ اپنے پروردگار کے حضور اپنی بندگی کا اقرار اور اپنے گناہوں کا اعتراف اس انداز سے کرتا ہے:

((اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُکَ وَ اَنَا عَلٰی عَھْدِ وَ وَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ)) (صحیح البخاری' کتاب الدعوات)

''اے اللہ! تو ہی میرا رب ہے' تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں' تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں تیرے عہد اور وعدے پر قائم ہوں جس قدر طاقت رکھتا ہوں۔''

آیئے سوچیں! ہمیں کیسی زندگی بسر کرنا ہے؟ من چاہی! جگ چاہی! یا رب چاہی؟؟

گویا ع فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم!

❁❁❁

بقیہ: تصورِ توحید کی امتیازی حیثیت

''کہو وہ اللہ ہے' یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔''

(نوٹ) اس تحریر کی تدوین و تیاری میں سید مودودیؒ کی کتاب ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی'' ان کی شہرۂ آفاق تفسیر ''تفہیم القرآن'' اور سید سلیمان ندویؒ کی کتاب ''خطبات مدراس'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہج انقلابِ نبوی ﷺ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل

اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک‘

اسلامی انقلاب کے مراحل‘ مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** حفظہ اللہ

کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

❁ صفحات: 375 ❁ قیمت اشاعت خاص: 300 روپے اشاعت عام: 200 روپے

❁❁❁

”منہج انقلابِ نبویؐ“ کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

❁ صفحات: 64 ❁ قیمت اشاعت خاص: 40 روپے ❁ اشاعت عام: 20 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے‘ ماڈل ٹاؤن لاہور‘ فون: 3-5869501

فرضیّتِ اقامتِ دین

اویس پاشا قرنی

گزشتہ ایام میں کچھ مخلصین واحباب کی جانب سے اِس بحث کا آغاز کیا گیا کہ آیا اقامت دین کی جدوجہد فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ بعد ازاں بحث کو جو اپنی اصل کے اعتبار سے خالص علمی اور فقہی بحث ہے' بلاوجہ عمومی مسئلہ کی صورت میں خلط مبحث کا شکار کر دیا گیا۔ کچھ افراد اِس بحث سے انتہائی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے اور یہ خلش ان کی تحریکی سرگرمیوں پر بھی اثر انداز ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں پیشِ نظر یہ ہے کہ نفسِ مسئلہ پر غور کیا جائے اور اس غلط فہمی اور خلطِ مبحث کی نشاندہی کی جائے جو مسئلہ کی بنیاد میں کارفرما معلوم ہوتی ہے۔ اِس کے بعد قدرے اختصار کے ساتھ فقہی تناظر میں اقامتِ دین کی فرضیت کے دلائل پر غور کیا جائے اور ساتھ ہی اِن اصطلاحات یعنی فرضِ عین' فرضِ کفایہ وغیرہ کی تعریفات جو اصول کی کتب میں ہیں' کا تعارف کروایا جائے اور اِن کے احکام سے واقفیت بہم پہنچائی جائے۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ دینِ اسلام اپنی ایک علمیت (Epistemology) رکھتا ہے اور اس کی ایک خاص تاریخ ہے۔ اسلام کی علمیت میں چند چیزیں اصول کی حیثیت رکھتی ہیں اور چند فروع کی۔ اس میں کسی بات کے ثبوت اور عدم ثبوت کی کچھ شرائط ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تاریخ میں عہد رسالت ﷺ میں تو معاملہ بہت سادہ ہے کہ جو مسئلہ درپیش ہوا اس میں براہِ راست رہنمائی وحی کے ذریعہ ہو رہی ہے' اور جہاں وحی خاموش ہے وہاں زبانِ رسالت ﷺ سے صادر ہونے والے کلمات ہدایت و رہنمائی کا آخری ذریعہ ہیں' کسی لمبے چوڑے اجتہاد و قیاس کی ضرورت نہیں۔ جہاں رہنمائی درکار ہوئی' وحی و رسالت اس میں فیصلہ کن ہدایت فرمانے کے لیے موجود ہیں' لیکن عہد رسالت مآب ﷺ کے بعد عہد صحابہؓ میں کسی شے کے مشروع ہونے کا ثبوت اللہ کا کلام اور نبی اکرم ﷺ کی سنت ٹھہرے۔ دورِ صحابہؓ میں کوئی سوال اگر جواب طلب ہوتا تو اس میں یہ دیکھا جاتا اور معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی کہ

اِس معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کی سنت کیا تھی۔ اگر جواب مل جاتا تو مزید غور وفکر کی ضرورت نہ رہتی' ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بارے میں اجتہاد فرماتے اور کسی رائے تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ اِس طرح بہت سے اُمور پر صحابہ کرامؓ کے درمیان اجماع ہوگیا اور بعد والوں کے لیے بذاتِ خود رہنمائی کا ایک ذریعہ ٹھہرا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ مقام ومرتبہ اِس لیے حاصل ہوا کہ یہ وہ جماعت ہے جس نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے علمِ دین حاصل کیا' اسے محفوظ رکھا اور پھر باحفاظت اگلی نسل کو اِس کی تعلیم دی۔

دورِ صحابہ میں بھی علم دین میں یہ سادگی برقرار رہی' مگر جیسے جیسے اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا' نئے نئے علم وتمدن کے مراکز اسلامی سلطنت کے دائرہ میں شامل ہوتے گئے تو ساتھ ہی اسلام کو علمی سطح پر کئی سوالات کے جواب دینا پڑے جس کے لیے اب باقاعدہ علوم کی تدوین ہوئی۔ لوگوں نے علم دین کے حصول اور اس کی ترتیب وتالیف کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور جاننا چاہیے کہ یہ اپنے دور کے بہترین صلاحیتوں کے مالک افراد تھے۔ اِس دور میں باقاعدہ قرآن وسنت سے احکام ومسائل اخذ کرنے کے لیے اصول مرتب ہوئے' علم حدیث کی تدوین ہوئی۔ جو لوگ حدیث رسول ﷺ کے جمع کرنے اور اس میں رطب ویابس کو الگ الگ کرنے میں مشغول ہوئے وہ محدثین عظام رحمہم اللہ کہلائے' ان کا شغل حدیثِ رسول ﷺ کے جمع کرنے اور اس سے متعلق علوم کی تدوین سے رہا۔ ان لوگوں نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ راویوں کے حالات' ان کے درمیان مراتب کا تعین' حدیث مقبول و غیر مقبول اور ان کی اقسام کا تعین کیا اور ان کے لیے تفصیلی احکام مرتب فرمائے۔

دوسری جانب وہ فقہائے کرام رحمہم اللہ ہیں جنہوں نے اِن نصوص یعنی قرآن مجید اور حدیث وآثار سے تفصیلی شرعی احکام کا استنباط کیا' نصوص سے احکام ومسائل کے استنباط و استخراج کے اصول مرتب فرمائے' احکام کے درمیان ان کے ثبوت اور ادائیگی کے اعتبار سے مراتب کا تعین کیا اور ان کے احکام مرتب کیے۔ اِسی کا نام فقہ ہے۔ فقہ اسلامی قرآن وسنت سے ہٹ کر کوئی شے نہیں' بلکہ یہ شریعت کی ان تفصیلات کا نام ہے جو ایک خاص علمی انداز میں مرتب کی گئی ہیں' اور اِن کا مرتب کیا جانا عین دین کا تقاضا اور اسلام کا مطلوب تھا۔ علمِ فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ کی گئی ہے:

العلم بالاحکام الشرعیة العملیة المکتسب من ادلتھا التفصیلیة

’’فقہ سے مراد شریعت کے ان عملی احکام کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہوں۔‘‘

اِس طرح علمِ دین تدوین کے مراحل سے گزر کر نسلاً بعد نسلٍ تواتر و تعامل اُمت کے ساتھ ہر عہد کے انسان کی رہنمائی کے لیے موجود رہا اور رہے گا۔ یہ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمتِ تکوینی یا وہ میکنزم (mechanism) ہے جس کے ذریعہ دینِ اسلام کی علمیت کا تحفظ ہوا ہے اور ہوتا رہے گا' ان شاء اللہ۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے ان ائمہ دین' فقہاء و محدثین پر جو اِس ربانی اسکیم کا حصہ بننے کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔ آمین!

اِس تمہید طولانی کی ضرورت اِس لیے پیش آئی کہ اگلی گفتگو میں موضوع زیر بحث کی مناسبت سے بنیادی حوالہ کی حیثیت اِسی علم فقہ کو حاصل رہے گی تو کوئی صاحبِ جذب یہ اعتراض نہ کر دیں کہ فقہ تو ’’عجمی سازش‘‘ ہے یا یہ کہ اِس کی تدوین تو دورِ ملوکیت میں ہوئی ہے' اِس لیے سرے سے قابل اعتنا ہی نہیں' وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ افراط و تفریط سے محفوظ فرمائے۔

اُمتِ مسلمہ میں گذشتہ صدی کے دوران احیائی تحریکوں کے کام پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ دینِ اسلام کو جب سیاسی طور پر مغلوبیت کا سامنا کرنا پڑا تو اِس دور میں اسلام کو سلطنت و ریاست کی سطح پر غلبہ و اقتدار کے مقام پر واپس سرفراز کرنے کی خواہش رکھنے والے کئی افراد نے احیاءِ دین کا بیڑا اٹھایا اور اپنے کام کی ناگزیر ضرورت کے طور پر انہیں دین کے تصور کے حوالہ سے ایک جدید تعبیر و تشریح کی ضرورت پڑی۔ اس تعبیر کے فرق کو سمجھنے کے لیے ان حالات کا صحیح ادراک ضروری ہے جو اِس جدید تعبیر کے متقاضی ہوئے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو صدی قبل ادیانِ عالم کے درمیان اصل فرق کرنے والی شے اس دین کے مابعد الطبیعیاتی تصورات' اس کے مراسمِ معبودیت اور اِن کے نتیجہ میں مرتب ہونے والی تہذیبی اقدار ہوا کرتی تھیں' جبکہ دورِ جدید میں اصل بحث نظاموں کی ٹھہری۔ اب نہ مابعد الطبیعیاتی تصورات اور نہ ہی مراسمِ عبودیت خارج میں موضوع بحث رہے۔ جدید تہذیب کا رشتہ مذہب سے بالکل ہی منقطع ہو گیا' اور کہا جانے لگا کہ اب اصل جنگ نظاموں کی ہے۔ اِس تناظر میں جب احیاءِ دین کے علم بردار افرادِ دعوت و عزیمت نے دینِ اسلام کی تعبیر و تشریح جدید دَور کے انسانوں کے فہم کے مطابق' رائج الوقت محاورہ میں کی تو اسلام کے جن تصورات کو مرکزی موضوع بنایا وہ اجتماعی گوشوں سے متعلق تھے اور ان کو ایک مربوط نظامِ فکر و عمل کے طور پر پیش کرنے کی بہترین کوشش کی' جس کے زیر اثر کئی جدید

اصطلاحات مرتب ہونے والے اسلامی لٹریچر کا حصہ بن گئیں۔ ہماری مراد ''اسلام کا سیاسی نظام' اسلام کا معاشی نظام'' وغیرہ سے ہے۔ اِس جدید لٹریچر میں کئی اور ایسے امتیازی پہلو ہیں جن کا ادراک زمان ومکان کے سیاق وسباق میں ضروری ہے۔ مثلاً قدیم اسلامی لٹریچر میں تمام گفتگو اس بات کو کالمشروط (understood) مان کر کی جارہی ہوتی ہے کہ جن احکامِ اسلام کی جزئیات اور فردعات پر تحقیق کی جارہی ہے ان کا تعلق عملی زندگی سے بہت گہرا ہے اور اِن کے نفاذ کے لیے اسلام کا ریاستی اور سیاسی ڈھانچہ موجود ہے' اسلام کو قوتِ نافذہ حاصل ہے۔

یہ وہ بنیادی مقدمہ ہے جو پورے قدیم اسلامی لٹریچر کے پیچھے کارفرما دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے ایسے موضوعات ہیں جو اس دور کے لٹریچر میں ہمیں نہیں ملتے۔ ظاہر ہے ایک چیز جو حاصل ہو اس کے حصول کی گفتگو تحصیلِ حاصل ٹھہرے گی اور یہ ایک کارِ عبث ہے جس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اِسی لیے اقامتِ دین یا دین اسلام کے نفاذ کی جدوجہد ہمارے متقدمین کے ہاں سرے سے موضوعِ بحث ہی نہیں۔ وہ تو اس سے اگلے مراحل کے اہم امور سرانجام دینے میں مصروف رہے۔ مثلاً قاضی ابویوسفؒ ''کتاب الخراج'' میں ان امور پر گفتگو فرمارہے ہیں جو ایک اسلامی سلطنت کے معاشی معاملات سے متعلق ہیں۔ امام محمدؒ ''سیر کبیر'' اور ''سیر صغیر'' میں اسلامی سلطنت کے دیگر اقوام سے تعلقات وغیرہ کی نوعیت اور اس کے احکام پر روشنی ڈالتے ہیں اور اپنے وقت کے اہم تقاضے کو پورا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ''سیر کبیر'' کی تصنیف مکمل ہوئی اور امام محمدؒ نے اسے خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا تو حکومت کی جانب سے جشن کا اہتمام کیا گیا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علماء کرام اس دور میں اسلامی ریاست کی علمی ضروریات کو پورا کررہے ہیں۔ کوئی ''ادب القاضی'' پر کتب تصنیف فرمارہا ہے تو کوئی اسلام کے قانون صلح وجنگ پر ''کتاب المغازی'' کی تفصیلات قلم بند کررہے ہیں۔ غرض یہ کہ ایک اسلامی ریاست کے قائم ہوجانے کی بعد کی جتنی ضروریات ہیں' وہی ہمارے علماء کرام کا زیادہ تر موضوع رہیں۔ اور یہ ایک فطری' مناسب اور معقول بات ہے کہ جب ریاست قائم ہوتو ان ہی گوشوں پر کام کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ اس کے قیام کی فرضیت یا عدمِ فرضیت پر گفتگو کی۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے اور اِسی تناظر میں اسلاف کے کام سے استفادے کو آگے بڑھانا چاہیے' اور ساتھ ساتھ حالات وواقعات میں جو تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں ان کا احساس کرتے ہوئے آج کے دینی تقاضوں کا ادراک کیا جانا ازبس ضروری ہے۔

اِس نکتہ کی تفہیم کے بعد دین کی جدید تعبیر وتشریح کے حوالے سے کوئی اشکال نہیں رہتا کہ یہ وقت کا اہم دینی تقاضا تھا جسے دورِ جدید کے اہل علم نے بحسن وخوبی ادا کیا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے سیاسی غلبہ کے خاتمے کے بعد جو لٹریچر تیار ہوا اس میں از سرِنو ریاست کے قیام کو ایک دینی فریضہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس کے لیے ایک استدلال بھی بغرضِ تفہیم وتبیین مرتب کیا گیا اور اِس کی پر زور دعوت احیائی تحریکوں نے مسلم معاشروں میں بلند کی۔ اِس استدلال کا انداز قانونی یا فقہی نہ تھا بلکہ قرآن وسنت کے نصوص سے اخلاقی سطح پر دعوتی انداز میں (نہ کہ فتویٰ وقضا کی زبان میں) مسلم معاشروں میں عوام الناس کو اپیل کیا گیا۔

اس دوران مسلم معاشروں میں دین کی نمائندگی دو مختلف طبقوں میں تقسیم ہوگئی' ایک تو وہ طبقہ تھا جو اِس نئی صورتحال یعنی سیاسی غلبہ کے خاتمہ کا ادراک کر کے تجدید واحیاءِ دین کی کوششوں میں سرگرم ہوگیا اور مسلم معاشروں میں از سرِنو ایمان وعمل کی دعوت اور اسلام کے دیگر اجتماعی احکام کی بجا آوری کے لیے ریاست کے قیام کو ہدف کے طور پر معین کر کے کام میں مصروف ہوگیا۔ دوسری جانب روایتی قدیم علوم (جو کہ سیاسی غلبہ کے تناظر میں مرتب ہوئے تھے) کے حاملین کا ایک طبقہ تشکیل پا گیا جو آج بھی گفتگو فتویٰ اور قضا کی زبان ہی میں کرتا ہے اور مسلم معاشروں میں جمعہ وجماعت' تعلیم واصلاح اور فتویٰ وارشاد کی ذمہ داریاں' طاغوت کے سیاسی غلبہ سے عدم تعرض کی پالیسی پر گامزن رہتے ہوئے' ماحول کی ناسازگاری کے باوجود سنبھالے ہوئے ہے۔ دین کی نمائندگی کرنے والے ان دونوں طبقات کے درمیان بھی ایک مستقل کشاکش جاری ہوگئی۔ اس کی بنیاد یہ بنی کہ احیاء کے علم بردار دوسرے طبقہ پر ان کے کام کے محدود اور غیر متعلق ہونے پر نقد کرتے رہے اور قدیم علوم کے وارثین اِس جدید تعبیر وتشریح سے متفق نہ ہوسکے۔ اِس کی کچھ وجہ تو یہ ہوئی کہ علماء کرام نے احیائی تحریکوں کے لٹریچر میں استعمال کردہ دعوت کی زبان کو قانون اور فتوے کی زبان کے طور پر لیا اور اس پر اپنے فتوے کے ذریعہ گرفت شروع کر دی' ورنہ حقیقتِ دین دونوں کے ہاں ایک ہی ہے' بس تعبیر کا فرق ہے۔ اِسی طرح احیائی تحریکات کی جانب سے بھی ایسی ہی غلطی کی گئی جسے ہم نے آغازِ مضمون میں خلط مبحث سے تعبیر کیا تھا کہ اپنے کام کے دوران دعوت وترغیب کی زبان میں بات کرتے کرتے قانون وفقہ کی خالص اصطلاحات کا استعمال بھی کر گئے جن کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔ یہی صورتحال فرضِ عین وفرضِ کفایہ کی بحث میں' اصل خلط مبحث اور غلط فہمی کی بنیاد ہے۔

یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ ہر علم کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں' جو اپنے خاص معنی و مفہوم رکھتی ہیں' جن کی اپنی وسعت اور محدودیت ایک لازمی امر ہے۔ اگر یہ توازن بگڑ جائے تو ابلاغ ہی ممکن نہ رہے۔ یہ لسانیات (linguistics) کا ایک اہم مسئلہ ہے جس کا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں کہ اصطلاحات کو ان کے سیاق و سباق اور اس فن کی اپنی اصلی تعریف (definition) کے حوالے سے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ اگلے صفحات میں ہم فرض عین اور فرض کفایہ کی اصطلاحی تعریف اور ان کے اطلاقات' احکام کا تعارف' فقہاء و اصولیین کی تصریحات کی روشنی میں کروانے کی کوشش کریں گے' تاکہ نفس مسئلہ کے تمام پہلو سامنے آجائیں اور ایک رائے تک پہنچنا آسان ہو جائے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اصول فقہ کی معتبر کتب سے اس بحث کے مقدمات کا ایک مختصر تعارف عام قارئین کے لیے کروایا جائے۔ جاننا چاہیے کہ اصول فقہ کی کتب میں اس موضوع پر ''حکم تکلیفی اور اس کی اقسام'' کے تحت گفتگو ہوتی ہے۔

حکم تکلیفی کی اجمالاً پانچ اقسام ہیں:(۱)

(۱) ایجاب (۲) ندب (۳) تحریم (۴) کراہت (۵) اباحت

احناف کے نزدیک ان کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱) فرض (۲) واجب (۳) سنت (مؤکدہ' غیر مؤکدہ) (۴) مندوب
(۵) حرام (۶) مکروہ تحریمی (۷) مکروہ تنزیہی (۸) خلاف اولیٰ (۹) مباح

یہ تقسیم احکام تکلیفی کے ثبوت اور حکم کے اعتبار سے ہے۔ علاوہ ازیں فقہاء نے کئی اور تقسیمات بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً حقوق اللہ اور حقوق العباد وغیرہ۔(۲)

اس تقسیم کی روشنی میں فرض اور واجب کی فنی تعریف ملاحظہ ہوں:

فرض: جس کے کرنے کا لازمی مطالبہ کسی دلیل قطعی سے ثابت ہو۔(۳)

واجب: جس کے کرنے کا لازمی مطالبہ کسی دلیل ظنی سے ثابت ہو۔(۴)

فرض اور واجب کی یہ تقسیم احناف کے نزدیک ہے' ورنہ جمہور کے ہاں یہ دونوں الفاظ مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

وجوب و فرضیت کے ثبوت کے ذرائع

وجوب و فرضیت کا ثبوت محض فعل امر اصطلاحی پر موقوف نہیں ہے کہ اگر صیغہ امر کی

صورت میں مطالبہ ہو تو ان کا ثبوت ہو ورنہ نہیں' بلکہ ان کے اصولی ذرائع تین ہیں:

(ا) وہ الفاظ جن کا لغوی مفہوم لزوم ہے' جیسے فرض' وجب' اوجب' كتب عليه' قضی۔

(ب) وہ الفاظ جو صرفی ونحوی اعتبار سے لزوم کا مفہوم رکھتے ہوں' یعنی فعل امر' اسم فعل بمعنی امر' مصدر' قائم مقام فعل۔ جیسے ارشاد باری ہے: ﴿فَضَرْبَ الرِّقَابِ﴾ کہ اس میں ضرب مصدر ''اِضرِبوا'' فعل امر کا قائم مقام ہے۔

(ج) غیر فعل امر' جب کہ فرضیت و وجوب کا تقاضا کرنے والے قرائن موجود ہوں۔ جیسے ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ یعنی يُرْضِعْنَ مضارع' امر کے معنی میں ہے۔(۵)

واجب کی مختلف تقسیمات

واجب کی اصولی طور پر چار تقسیمات ہیں' جن کو اکثر فقہاء نے جاری کیا ہے:

(ا) واجب کی تقسیم وقتِ ادا کے اعتبار سے۔

اس کی مزید دو قسمیں ہیں:

(۱) واجب مطلق (۲) واجب مقید یا موقت

(ب) واجب کی تقسیم مکلفین کے اعتبار سے۔

اس کی بھی مزید دو قسمیں ہیں:

(۱) الواجب العینی (۲) الواجب الکفائی

(ج) واجب کی تقسیم مقدار مطلوب کے اعتبار سے۔

اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) الواجب المحدد (۲) الواجب غیر المحدد

(د) واجب کی تقسیم تعین کے اعتبار سے۔

اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) الواجب المعین (۲) الواجب المخیر

ان تقسیمات کی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم موضوع زیرِ بحث سے متعلق تقسیم یعنی ''واجب کی تقسیم مکلفین کے اعتبار سے'' پر اپنی گفتگو آگے بڑھاتے ہیں۔ (یہاں پر نوٹ فرما لیں کہ کسی امر کا واجب کفائی ہونا اس کی اہمیت میں کمی نہیں کرتا' جیسا کہ اکثر افراد کو دیکھا گیا ہے کہ

استخفافِ حکم کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ ''یہ تو فرض کفایہ ہے''، جب کہ فرق فرضیت کا نہیں بلکہ جن افراد سے اس کی ادائیگی مطلوب ہے ان کی نسبت سے ہے۔ تفصیل آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔)

تقسیم الواجب من حیث المکلف بادائه

(۱) الواجب العینی (۲) الواجب الکفائی

فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کی تعریف' علماءِ اصول کی تصریحات کی روشنی میں

☆ الاستاذ الدکتور حسین حامد حسان اپنی تالیف اصول الفقہ میں رقم طراز ہیں:

فالواجب العینی ما کان التکلیف فیه مقصودا به حصول الفعل من فاعل معین کالصوم والصلاة والحج والوفاء بالعقود واعطاء الزکاة ۔ فهذه الواجبات قد قصد الشارع حصولها من کل فرد من افراد المکلفین بحیث لا یقسط الواجب عن المکلف الا فعل نفسه ولا یسأل اذا لم یقم بالواجب غیره ۔ وسمی هذا بالواجب المعین لان ذات المکلف وعینه مقصود بالتکلیف(٦)

''پس فرضِ عین سے مراد وہ فرض ہے جس میں تکلیف سے کسی معین فاعل سے فعل کی تعمیل مقصود ہو' جیسے روزہ' نماز' حج' عہد کو پورا کیا جانا' زکوۃ کا ادا کرنا۔ ان واجبات میں شارع کا مقصود ان کا حصول ہے ہر فرد مکلّف سے اس طرز پر کہ مکلّف سے فرض ساقط نہیں ہوتا مگر صرف اس طور پر کہ وہ خود اس کو ادا کرے اور اس سے سوال نہیں کیا جائے گا دوسروں کے بارے میں جبکہ دوسرے اسے ادا نہ کریں۔ اِس کو فرض عین کا نام دیا گیا ہے' اِس لیے کہ یہاں تکلیف سے مقصود ایک معین فرد سے کام کا کروانا ہے۔''

اور فرض کفایہ کی تعریف دکتور حسین حامد حسان نے یوں کی ہے:

وما الواجب الکفائی فهو ما کان التکلیف فیه مقصودا به حصول الفعل دون نظر الی الفاعل' کردّ السلام والجهاد والامر بالمعروف والنهی عن المنکر' والتخصص فی علوم الشرع کالفقه والحدیث' والتفسیر والاصول او فیما لا بد منه للأمة کالطب والهندسة والزراعة وغیرها۔ ومنه الواجبات الاجتماعیة کاغاث الملهوف' وسدّ خلّة المحتاج وتعلیم الجاهل و علاج المریض وانقاذ الغرقی والحرقی وغیر ذلك۔ فهذه الواجبات یظهر من التکلیف بها قصد الشارع الی

حصولها فی الامۃ من ایّ فرد من افراد المکلفین وسمّی ھذا الواجب کفائیا ؛ لانہ یکفی فی حصول الواجب ان یقوم بہ بعض المکلفین[۷]

''اور جہاں تک فرضِ کفایہ کا تعلق ہے تو یہ وہ فرض ہے جس میں تکلیف کا مقصد حصولِ فعل ہے' اِس بات سے قطع نظر کہ فاعل کون ہے' جیسے سلام کا جواب دینا' جہاد' امر بالمعروف ونہی عن المنکر' علومِ شرعیہ میں تخصص جیسے فقہ' حدیث' تفسیر' اصول یا ان شعبوں میں مہارت پیدا کرنا جو اُمت کے لیے ناگزیر ہیں' جیسے طب' ریاضی' زراعت وغیرہ' اور اسی میں سے ہیں وہ اجتماعی فرائض جیسے مظلوم کی فریادرسی کرنا' ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنا' پانی میں ڈوبنے والے یا آگ میں جلنے والے کو بچانا اور اسی طرح دیگر امور۔ اِن فرائض سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں شارع کا مقصود ان کی ادائیگی ہے افرادِ اُمت میں سے کسی سے بھی' اور اِس فرض کو فرض کفایہ کہتے ہیں' اس لیے کہ فرض کی ادائیگی کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کو بعض مکلفین ادا کر دیں۔''

☆فواتح الرحموت شرح مسلّم الثبوت میں فرضِ کفایہ کی تعریف اس طرح درج ہے:

الواجب علی الکفایہ:ای الواجب الذی من شانہ ان یثاب الآتون بہ ولا یعاقب التارکون اذا اتی بہ البعض' وان لم یات بہ احد یعاقب الکل[۸]

''فرضِ کفایہ یعنی وہ فرض جس کا معاملہ یہ ہے کہ ادا کرنے والے کو ثواب ہوتا ہے اور نہ کرنے والے کی پکڑ نہیں جبکہ کچھ افراد نے اسے ادا کر دیا ہو' اور اگر کسی نے بھی ادا نہ کیا تو سب کی پکڑ ہوگی۔''

فرضِ کفایہ کی مثال دیتے ہوئے صاحبِ فواتح تحریر کرتے ہیں:

فاذا حصل المقصود لا یبقی الواجب واجبا کالجھاد' فانہ انما وجب لاعلاء کلمۃ اللّٰہ تعالیٰ' فاذا اتی بہ البعض حصل الاعلاء وسقط الوجوب[۹]

''پس جب مقصود حاصل ہو جائے تو واجب کا وجوب باقی نہیں رہتا' جیسے فریضہ جہاد۔ جہاد کی فرضیت تو اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے ہے' جب کچھ افراد نے اس کی ادائیگی کر دی اور اللہ کا کلمہ سربلند ہو گیا تو اس صورت میں وجوب بھی ساقط ہو گیا''۔

یہاں مثال ہمارے موضوع ہی سے متعلق لائی گئی ہے۔ بات بہت معقول ہے اور آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ فرضِ عین میں اصلاً ہر ہر مکلّف کی شخصی آزمائش مطلوب ہے اور فرضِ کفایہ

وہ فرض ہوتا ہے جس میں اصلاً آزمائش گروہِ مکلفین کی مطلوب ہوتی ہے اس طور پر کہ کوئی ایسا فریضہ عائد کیا جاتا ہے جس میں مخلوق کا اجتماعی مفاد ہو۔ اب ظاہر ہے کہ جب وہ مفاد حاصل ہو گیا تو ہر ایک سے اس کی ادائیگی کا مطالبہ تحصیل حاصل ہے۔ مثلاً کسی دریا کے کنارے کئی لوگ کھڑے ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ ایک بچہ پانی میں ڈوب رہا ہے۔ اب اللہ کا یہ مطالبہ تمام حاضرین کی طرف متوجہ ہے کہ اس کو بچانے کی سعی کریں اور جس میں فنِ تیراکی کی مہارت جتنی زیادہ ہے اس سے اسی درجے میں مطالبے کی شدت بھی بڑھ جائے گی۔ (اس پہلو پر ہم آئندہ صفحات میں علیحدہ سے گفتگو کریں گے۔) جب حاضرین میں سے ایک ماہر تیراک غوطہ لگا کر ڈوبنے والے کو بچا لیتا ہے تو یہ فریضہ سب سے ساقط ہو گیا۔ بچانے والا خصوصی اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے اور صاحب عزیمت شمار ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ مطالبہ کرے کہ صاحب! خطابِ شرع تو ہر ایک کی جانب متوجہ تھا' لہٰذا ہر شخص فرداً فرداً ڈوبنے والے کو بچائے تو ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ نامعقول ہو گا۔ اسی پر قیاس کر لیجیے فریضہ اقامت دین' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو کہ اقامت دین کے فریضے کے لیے جتنی قوت درکار ہے اگر فراہم ہو جائے تو باقی افراد پر سے فرض ساقط ہو گیا' اور اگر ایسا نہ ہو تو حسبِ استعداد درجہ بہ درجہ گناہ کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے گا' حتیٰ کہ تمام اُمت کو محیط ہو جائے گا۔

☆ الاستاذ الدکتور وھبہ الزحیلی 'الوجیز فی اصول الفقہ' میں بیان کرتے ہیں:

الواجب العینی: هو ما طلب الشارع فعله من كل مكلف على حدة ولا يجزى قيام مكلف به عن آخر' كالصلاة والزكاة والحج واجتناب المحرمات كالخمر والزنا والميسر والربا' وحكمه: انه يلزم الاتيان به من كل مكلف ولا يسقط طلبه بفعل بعض المكلفين دون بعض(۱۰)

''فرضِ عین وہ ہے جس کے کرنے کا شارع نے مطالبہ کیا ہو ہر مکلف سے علیحدہ علیحدہ اور ایک کے ادا کرنے سے دوسرا بریٔ الذمہ نہ ہو' جیسے نماز' زکوٰۃ' حج کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب جیسے شراب' زنا' جوا اور سود سے بچنا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا ادا کرنا ہر مکلف پر لازم ہے' کچھ کے ادا کرنے سے باقی افراد سے فرض ساقط نہیں ہوتا۔''

الواجب الكفائی: هو ما طلب الشارع حصوله من مجموع المكلفين لا من كل فرد على حدة' فاذا قام به البعض سقط الاثم عن الباقين' كتعليم الصناعات المختلفة وبناء المشافي والصلاة على الجنائز

وردّ السلام والجهاد والقضاء والافتاء والامر بالمعروف والنھی عن المنکر وانقاذ الغریق واطفاء الحریق واداء الشھاد(۱۱)

''فرضِ کفایہ وہ فرض ہے جس کی ادائیگی کا مطالبہ شارع نے تمام مکلفین سے اجتماعی طور پر کیا ہے نہ کہ ہر فرد سے علیحدہ علیحدہ۔ جب اِس کو بعض مکلفین ادا کر دیں تو باقی پر سے ادا نہ کرنے کا گناہ ساقط ہو جاتا ہے' جیسے مختلف صنعتوں کی تعلیم' ہسپتالوں کا تعمیر کرنا' نمازِ جنازہ ادا کرنا' سلام کا جواب دینا، جہاد میں شریک ہونا' قضاء وافتاء کی ذمہ داری ادا کرنا' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا' ڈوبنے والے کو بچانا' آگ کا بجھانا اور گواہی دینا۔''

☆ الدکتور سید عبدالکریم زیدان اپنی تالیف الوجیز فی اصول الفقہ میں اِس مسئلہ کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

''فرضِ عین جس میں ہر مکلّف سے لازمی مطالبہ ہو' یعنی واجب عینی وہ ہے جس کے حصول کا شارع نے ہر مکلّف سے مطالبہ کیا ہو۔ اِس میں کچھ کا بجالانا اور کچھ کا نہ انجام دینا کافی نہیں' جب تک مکلّف اسے ادا نہیں کرے گا بری نہ ہوگا' کیونکہ اِس میں شارع کا مقصود اُس وقت پورا ہوگا جب ہر مکلّف اِسے بجالائے۔ اسی وجہ سے اِس کے چھوڑنے والے کو گناہ بھی ہوگا اور عذاب بھی' اور مکلّف کی طرف سے کسی اور کا بجالانا بھی اس کے لیے کافی نہیں۔ گویا اس واجب میں جو ملحوظ ہے وہ نفسِ فعل بھی ہے اور نفسِ فاعل بھی۔ اِس کی مثال نماز' روزہ' وعدوں کا پورا کرنا اور ہر حق دار کو اس کا حق دینا ہے۔''(۱۲)

فرضِ کفایہ: جس کا شارع مکلفین کی ایک جماعت سے مطالبہ کرے ہر فرد سے نہیں' کیونکہ اس واجب میں شارع کا مقصود جماعت سے اِس کا حصول ہے نہ کہ مکلّف کو اِس میں آزمانا ہے۔''(۱۰)

''کچھ کے ادا کرنے سے باقی سب سے ساقط ہو جائے گا...... کیونکہ بعض کا فعل دوسرے بعض کے فعل کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔ اِس اعتبار سے چھوڑنے والا بھی فاعل شمار ہوگا' اور اگر کسی نے بھی اسے انجام نہ دیا تو تمام قادرینِ فعل گنہگار ہوں گے۔ گویا اس واجب میں مطالبہ فعل کے کرنے پر منحصر ہے نہ کہ معین فاعل پر۔ جب کہ واجب عینی میں فعل کا حصول ہر مکلّف کی طرف سے ضروری ہوتا ہے۔ عموماً فرض کفایہ کا تعلق مفادِ عامہ کے ساتھ ہوتا ہے۔''(۱۵)

بعض اوقات فرض کفایہ‘فرضِ عین کی صورت اختیار کر جاتا ہے

جیسا کہ واضح کیا جاچکا ہے‘فرضِ کفایہ اور فرضِ عین میں کوئی جوہری یا باعتبار فرضیت کوئی فرق نہیں‘ بلکہ اصل فرق ادائیگی میں واقع ہوتا ہے‘یعنی فاعل مکلف کی جہت سے‘ اور اس حوالہ سے اِس پر احکام کا ترتب ہوتا ہے۔ اس موضوع کے اطراف و جوانب میں تو کئی دیگر نکات زیر بحث آتے ہیں مگر ہم صرف ان ہی کا تذکرہ کریں گے جن کی تفہیم ہمارے خاص احوال سے متعلق ہے۔

جاننا چاہیے کہ بعض اوقات فرض کفایہ‘فرض عین کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ان کی صورتیں ممکن ہیں‘ آیئے ملاحظہ فرمائیں:

الوجوب الکفائی قد یصیر واجبا عینیا اذا لم یوجد الا فرد واحد یستطیع القیام به‘ فاذا تعین فرد للشهاد ة وتوقف ثبوت الحق علی شهادته صار اداء الشهادة واجبا عینیا علیه لان قصد الشارع حصول الواجب وقد توقف هذا الحصو ل علی فعله و کذلك اذا تعین فرد لا نقاذ الغریق و اطعام الجائع او علاج المریض(١٦)

’’فرضِ کفایہ بعض اوقات فرضِ عین بن جاتا ہے جب ایک شخص کے علاوہ کوئی اور اس کی ادائیگی کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ جیسے اگر ایک شخص کا تعین ہوگیا گواہی دینے کے لیے اور ثبوتِ حق اس کی گواہی پر موقوف ہو تو گواہی دینا اس پر فرض عین ہو جائے گا‘ اس لیے کہ شارع کا مقصود واجب کا حصول ہے اور یہاں حصولِ واجب موقوف ہے اِس شخص کے فعل پر‘ اور اسی طرح جب ایک فرد کا تعین ہو جائے ڈوبنے والے کو بچانے پر‘ بھوکے کو کھانا کھلانے پر یا مریض کے علاج پر (تو ان پر یہ امور فرض عین ٹھہریں گے۔)‘‘

☆ دکتور وھبہ الزحیلی اسی بات کو دوسری مثال سے سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

واذا تعیّن فرد لاداء الواجب الکفائی صار واجبا عینیا‘ فلو شاهد الغریق شخص یحسن السباحة وجب علیه انقاذه ‘ ولو لم یر الحادثة الا شخص واحد‘ ودعی للشهادة وجب علیه اداء ها ‘ولو لم یوجد فی البلد الا طبیب واحد تعین الاسعاف والا ستطباب(١٧)

’’پس جب تعین ہو جائے ایک فرد کا فرض کفایہ کی ادائیگی کے لیے تو اس پر وہ فرضِ کفایہ فرضِ عین ہو جاتا ہے‘ جیسے اگر کوئی شخص دریا میں ڈوب رہا ہو اور دیکھنے والوں میں ایسا

آدمی موجود ہو جو تیراکی میں مہارت رکھتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ ڈوبنے والے کو بچائے' اوراسی طرح اگر کسی حادثہ کا دیکھنے والا صرف ایک ہی شخص ہو اور اسے گواہی کے لیے بلایا جائے تو اس پر شہادت کا ادا کرنا واجب ہے' اوراسی طرح اگر کسی شہر میں ایک ہی ڈاکٹر پایا جائے تو اس پر مریضوں کی مدد اور علاج کرنا متعین ہو جائے گا۔''

معلوم ہوا کہ وہ فرض جو اپنی اصل کے اعتبار سے تو فرض کفایہ تھا' خارجی احوال کی وجہ سے اس کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آج حکمرانوں پر دین کا قیام فرضِ عین ہے' اس لیے کہ صاحبِ اقتدار ہونے کی وجہ سے اقامتِ دین ان پر فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ بنابریں مسئولیت کا دائرہ شعور اور مقدور کی نسبت سے وسیع ہوتا چلا جائے گا۔

یہ تو اصول کا بیان تھا' ایک نظر اطلاقی اور عملی صورتِ واقعہ پر ڈالتے چلیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں:

''جس زمانے میں فقہ کی یہ کتابیں لکھی گئی تھیں اُس وقت ممالکِ اسلامیہ میں سے کسی جگہ بھی اسلامی قانون منسوخ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی حدودِ شرعیہ معطل ہوئی تھیں' اس لیے انہوں نے صرف ہجومِ عدو (دشمن کا چڑھ دوڑنا) ہی کی حالت کا حکم بیان کیا ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کے اپنے وطن میں کفر کا قانون نافذ اور اسلام کا قانون منسوخ اور اختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو حدود اللہ کی اقامت کو وحشیانہ فعل قرار دیتے ہیں تو معاملہ ہجومِ عدو کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ سخت ہو جاتا ہے اور اس صورت میں کوئی شخص جو دین کا کچھ فہم بھی رکھتا ہو' اقامتِ دین کی سعی کو محض فرضِ کفایہ نہیں کہہ سکتا۔''(۱۸)

فرضِ کفایہ کے ترک کا وبال اور گناہ

☆ استاذ عبدالکریم زیدان اس بارے میں اصول کی کتب میں بکھری ہوئی بحث کا خلاصہ اِس طرح پیش کرتے ہیں:

''اگر واجب کفائی ادا نہ ہو تو سب گناہگار ہوں گے' کیونکہ تمام اُمت سے اس کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ پس جو شخص اِس فعل پر قادر ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اسے ادا کرے اور جو عاجز ہے اس پر لازم ہے کہ قادر کو اِس پر اُبھارے۔ ادا نہ ہوا تو سب قصوروار ہوں گے' قادر اس لیے کہ اس نے فعل ادا نہیں کیا اور عاجز اس لیے کہ اس نے قادر کو اس فعل کی ترغیب دے کر ابھارا نہیں۔''(۱۹)

☆ حضرت امام شافعیؒ فرض کفایہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اگر سب نے اسے ضائع کر دیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ گناہ کے دائرے سے کوئی بھی باہر نہ رہ سکے گا۔''(۲۰)

فرضِ کفایہ میں خطابِ شرع کس کی طرف متوجہ ہے؟

اس ذیل میں اصولیین کی مختلف تعبیرات ملتی ہیں' مگر جو رائے نفس مسئلہ سے قریب ہے اس کا تذکرہ کرتے ہیں:

ان الخطاب فی الواجب الکفائی یتوجه الی جمیع من تتوا فر فیهم شروط القیام بالواجب ویتمکنون من تحصیله' فاذا کان الواجب یتأدی بفعل بعض القادرین علی تحصیله وجب علی الامة ان تضع نظاما لتوزیع مسئولیة اداء الواجب بینهم(۲۱)

''یقیناً خطابِ شرع فرضِ کفایہ میں ان تمام افراد کی جانب متوجہ ہوتا ہے جن میں اس فریضہ کی ادائیگی کی شروط پائی جاتی ہوں اور وہ اس فریضہ کی ادائیگی کی قدرت رکھتے ہوں اور جب واجب اس نوعیت کا ہو جس کی ادائیگی اس کی تحصیل پر قادر بعض لوگوں کے کرنے سے ہو جاتی ہے تو امت پر واجب ہو گا کہ وہ واجب کفایہ کی ادائیگی کی مسئولیت آپس میں تقسیم کرنے کے لیے کوئی نظام وضع کرے۔''

☆ اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے صاحبِ فواتح فرماتے ہیں:

''اگر کسی قرض کے معاملے میں دو کفیل ہوں تو اگر ایک بھی قرض خواہ کا مطالبہ پورا کر دے تو کفالت کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی' دوسرے سے مطالبہ ساقط ہو جائے گا۔''(۲۲)

جب یہ معلوم ہو گیا کہ دینی فرائض میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی ادائیگی کا مطالبہ ہر فرد سے الگ الگ ہے اور کچھ فرائض ایسے ہیں جن کی ادائیگی کا مطالبہ من حیث الکل اُمت سے ہے تو آپ سے آپ اجتماعی فرائض' جن کا تعلق مفادِ عامہ سے ہے' کے لیے نظم اجتماعی جسے جدید دور میں حکومت و ریاست سے تعبیر کیا جاتا ہے' کی اہمیت و ضرورت واضح ہوتی ہے۔ دین اسلام کے وہ احکامات جن کی ادائیگی بغیر نظم اجتماعی کے ممکن نہیں' ان کے بارے میں فقہ اسلامی کا موقف اس طرح واضح کیا گیا ہے:

''اُمت پر لازم ہے کہ وہ حکومت کی نگرانی کرے' اِسے واجباتِ کفایہ کی ادائیگی پر آمادہ کرے یا اِس کی ادائیگی کے لیے جو اسباب ضروری ہیں وہ مہیا کرے۔ کیونکہ مفاد عامہ کے حصول کے لیے حکومت اُمت کی نائب ہے اور حکومت فرائضِ کفایہ کی ذمہ

داری کو نبھا سکتی ہے۔(۲۳) اگر حکومت اِس سے قاصر رہی تو پوری اُمت گناہگار ہوگی کہ اس نے حکومت کو ان اسباب کے لیے تیار کیوں نہیں کیا جن سے فرائض کی ادائیگی ہوتی ہے اور حکومت اس لیے گناہگار ہوگی کہ اس نے قادر ہونے کے باوجود فرض کفایہ کو ادا نہ کیا۔"(۲٤)

مسلمانوں کی آبادیوں اور حکومتوں کا شرعی حکم

وہ علاقے جہاں مسلمان کثرت سے آباد ہیں اور ان پر حکمرانی بھی کلمہ گو مسلمان کر رہے ہیں مگر شریعت اسلامیہ نافذ نہیں ہے' یعنی قرآن وسنت کے احکامات کی روشنی میں نظم اجتماعی کا م نہیں کر رہا بلکہ حکومتی سطح پر اسلام سے متضاد احکام وقوانین نافذ العمل ہیں' ایسے ممالک کا شرعی حکم کیا ہے؟ ظاہر ہے یہ ایک نئی صورت حال ہے' اسلام کو صدرِ اوّل میں اس سے سابقہ نہیں پڑا' چنانچہ شرعی حکم بھی اس دور میں سادگی سے بیان ہو جایا کرتا تھا' تقسیم صرف دارالکفر اور دارالاسلام کی تھی' آج کا معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ اس بحث میں دیگر کئی امور کا لحاظ ضروری ہے ورنہ مقاصدِ شریعت کا بجا طور پر تحفظ نہ ہو سکے گا۔ جب دارالکفر اور دارالاسلام کے شرعی احکامات میں اس قدر پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی تھی تو اس وقت ہمارے جلیل القدر ائمہ کی آراء اسی سادگی کی شان لیے ہوئے ہیں جو اُس دور کا تقاضا تھی۔

امام ابوحنیفہؒ دارالکفر کی تین شرائط بیان فرماتے ہیں:

(۱) ان تعلوها احکام الکفر

(۲) ذهاب الامان للمسلمین

(۳) ان تکون تلك الدار مجاورة لدار الکفر' بحیث تکون مصدر خطر علی المسلمین وسببا فی ذهاب الامن۔(۲۵)

یعنی:

(۱) اس ملک میں غلبہ وسربلندی کفریہ احکام کو حاصل ہو۔

(۲) مسلمانوں کے لیے امان نہ رہے۔

(۳) اس ملک کی سرحدیں دارالکفر سے ملتی ہوں اس طور سے کہ مسلمانوں کے لیے خطرات اور نقضِ امن کا باعث ہو۔

اس عنوان کے تحت صاحبین رحمہما اللہ کی رائے ملاحظہ ہو:

(۱) وأفتی الامام محمدؒ والامام ابو یوسفؒ' صاحبا ابی حنیفةؒ 'بان حکم الدار

تابع للا حکام تعلوھا' فان کانت الاحکام التی تعلوھا ھی احکام الاسلا فھی دارالاسلام وان کانت الاحکام التی تعلوھا ھی احکام کفر'فھ دارالکفر(۲۶)

''اورفتویٰ دیا امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ نے جو شاگرد ہیں امام ابوحنیفہؒ کے اس پر کہ کسی ریاست کا حکم تابع ہوگا ان احکام کے جن کی بالادستی وہاں مانی گئی ہو'پس اگر وہ احکام جو اس ملک میں نافذ ہیں وہ اسلامی احکام ہیں تو وہ ملک دارالاسلام کہلائے گا اور اگر وہاں کفریہ احکامات نافذ ہیں تو وہ دارالکفر کہلائے گا۔''

جو بات ہم قارئین کے لیے واضح کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آج اگر اس سادہ تعریف ہی کو لیں تو بھی یہ امر واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ اس وقت روئے ارضی پر جتنے بھی ممالک پائے جاتے ہیں اگرچہ وہاں بسنے والوں کی اکثریت مسلمانوں پر مبنی ہے' وہ بھی اِس تعریف کی رو سے دارالاسلام نہیں کہلائے جا سکتے اور یہ بات اتنی سامنے کی ہے کہ اس کے لیے مثالوں وضاحت کی حاجت نہیں۔ ہر وہ شخص جو اسلامی شریعت سے واقف ہے اور آج کی دنیا پر نگا رکھتا ہے وہ اِس کی گواہی دے گا۔ اس تناظر میں آج مسلمانوں کی فرائض وواجبات کی فہرست میں جس فرض کو ایک خاص اہمیت کا حامل ہونا چاہیے وہ فریضہ اقامت دین ہے۔ اقامت دین کی جدوجہد مسلمانوں پر اجتماعی طور پر فرض ہے۔ یہ بات ہم کوئی اپنے پاس سے کسی جدید استدلال کی روشنی میں نہیں لکھ رہے بلکہ جلیل القدر ائمہ دین کی تصریحات اس پر سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ کچھ اقتباسات بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے

☆ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

یجب ان یعرف ان ولایۃ امر الناس من اعظم واجبات الدین لاقیام للدین الا بھا(۲۷)

''اِس بات کا جاننا ضروری ہے کہ ریاست وحکومت کا قیام دین کے عظیم ترین فرائض میں سے ہے' دین کا قیام اس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔''

☆ امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں فرضیت نصب امامت کے بارے میں فرماتے ہیں:

ولا خلاف فی وجوب ذلک بین الامۃ ولا بین الائمۃ(۲۸)

''نصبِ امامت کے فرض ہونے میں اُمت اور ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔''

☆علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں:

ان نصب الامام واجب' فقد عرف وجوبه فی الشرع باجماع الصحابة والتابعین ...... وکذا فی کل عصر من الاعصار' واستقر ذلک اجماعا دالا علی وجوب نصب الامام(۲۹)

''بے شک امام (خلیفہ) کا مقرر کرنا فرض ہے' اِس کا وجوب شریعت سے' صحابہ وتابعین کے اجماع سے ثابت ہوتا ہے......اوراسی طرح ہر زمانے میں ہوتا رہا اوراس بات پر اجماع ہوگیا جونصب امامت کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔''

☆امام ابن حزمؒ فرضیت امامت کبریٰ پر اجماع نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لم یخالف فی هذا الا فرقة من الخوارج فانهم قالو: لا یلزم الناس فرض الامام انما علیهم ان یتعاطوا الحق بینهم ؛ وهذه فرقة ما نری بقی منهم احد(۳۰)

''نصب امامت کے وجوب پر جو اجماع ہے اس کی کسی نے مخالفت نہیں کی سوائے خوارج میں سے ایک فرقہ کے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں پر یہ لازم نہیں کہ وہ امام مقرر کریں' بلکہ ان پر تو اس قدر ذمہ داری ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق برابر ادا کریں۔اور ہمارے خیال میں اس فرقہ میں سے کوئی بھی آج موجود نہیں۔''

(امام ابن حزمؒ نے اپنے دور کے فرقوں کا تذکرہ کیا ہے اور طمینان کا سانس لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فرضیت اقامت دین کے انکاری فتنہ پرور گروہ میں سے کوئی آج باقی نہیں۔انہیں کیا معلوم تھا کہ آئندہ صدیوں میں مغربی سمت سے سیکولرازم کے نام سے کفر والحاد کا جو سیلاب عالم اسلام پر آنے والا ہے وہ اس اجماع کے بند میں شگاف ڈالنے کی کوشش کرے گا۔)

آخر میں ہم فرضیت اقامت دین پر امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصریحات نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔آپؒ نے اس مسئلہ میں کافی کلام فرمایا ہے جس میں سے متعلقہ حصہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

آنکه معلوم بالقطع است ازملت محمدیه علی صاحبها الصلوات والتسلیمات که آنحضرت ﷺ چوں مبعوث شدند برائے کافه خلق الله با ایشاں معامله ہا کردند تصرفها نمودند و برائے ہر معامله نواب تعین فرمودند و اہتمام عظیم در ہر معامله

مبذول داشتند چوں آں معاملات را استقراء نمائیم واز جزئیات بکلیات واز کلیات به کلی واحد که شامل ہمه باشد انتقال کنیم جنس اعلٰی آں "اقامت دین" باشد که متضمن جمیع کلیات ست وتحت وے اجناس دیگر باشند (۳۱)

''یہ بات ملتِ محمدیہ ﷺ پر غور وفکر کرنے سے قطعیت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ آنجناب ﷺ تمام خلق اللہ کے لیے مبعوث ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے مخلوق کے ساتھ بہت سے معاملات وتصرفات کیے اور ہر معاملہ کے لیے اپنا نائب مقرر فرمایا اور ہر معاملہ میں اہتمام عظیم فرمایا۔ ان معاملات کا جب ہم احاطہ کرتے ہیں اور جزئیات سے کلیات کی طرف اور پھر کلیات سے ایسے کلیہ واحد کی جانب منتقل ہوتے ہیں جو تمام امور کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو وہ جنس اعلیٰ 'اقامت دین'(۳۲) قرار پاتی ہے جو تمام کلیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور بہت سی دیگر اجناس اس کے تحت آتی ہیں۔''

فریضہ اقامت دین کی عظیم الشان اہمیت کو انتہائی بلیغ انداز میں بیان کرنے کے بعد شاہ صاحبؒ اقامت دین کی واقعاتی ضرورت کو واضح کرتے ہیں:

آنحضرت ﷺ بجہاد و نصب امراء و بعث جیوش و سرایا و قیام آنحضرت ﷺ بقضا درخصومات و نصب قضاۃ در بلاد اسلام و اقامت حدود و امر بالمعروف و نہی عن المنکر مستغنی از آں ست که به تنبیه احتیاج داشته باشد و چوں آنحضرت ﷺ به رفیق اعلٰی انتقال فرمودند واجب شد اقامت دین بہماں تفصیل که گزشته و اقامت دین موقوف افتاد برنصب شخصے که اہتمام عظیم فرماید دریں امر۔(۳۳)

''آنحضرت ﷺ کا جہاد کو قائم رکھنا اور سرداروں کا مقرر کرنا اور جیوش وسرایا کا روانہ کرنا اور خصومات میں فیصلہ کرنا' بلاد اسلامیہ میں قاضیوں کا مقرر کرنا' حدود کا قائم کرنا' اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے منع کرنا' یہ امور تفصیلی دلائل کے محتاج نہیں ہیں۔ چنانچہ پھر جب آنحضرت ﷺ نے رفیق اعلیٰ کی طرف انتقال کیا تو (آپ ﷺ کی وفات کے بعد) اسی تفصیل مذکورہ کے ساتھ دین کا قائم رکھنا واجب ٹھہرا اور اقامت دین موقوف تھا ایک ایسے شخص کے (خلیفہ) مقرر ہونے پر جو اس معاملہ میں

اہتمام عظیم کرے۔"

آگے چل کر شاہ صاحبؒ اقامت دین کے واجب بالکفایہ ہونے کی تصریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔ (فرضِ کفایہ کی صحیح تعریف تمام تفاصیل کے ساتھ جو گزشتہ اوراق میں بیان کی گئی ہے ملحوظ رہے۔)

> مسئله واجب بالکفایه است بر مسلمین الی یوم القیامه نصب خلیفه مستجمع شروط (۳۴)

"مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر جامع الشرائط خلیفہ کا مقرر کرنا فرضِ کفایہ ہے روزِ قیامت تک"۔

مزید فرماتے ہیں:

> خدائے تعالی جہاد و قضاء و احیائے علوم دین و اقامت ارکان اسلام و دفع کفار از خونه اسلام فرض بالکفایه گردانید وآں ہمه بدون نصب امام صورت نگیرد و مقدمه واجب واجب است کبار صحابه بریں وجه تنبیه نموده اند(۳۵)

"خدا تعالیٰ نے جہاد کو' قضاء کو' علومِ دینیہ کے زندہ کرنے کو' ارکانِ اسلام کے قائم کرنے کو' بلادِ اسلامیہ سے کفار کے دفع کرنے کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور تمام اُمور امام (یعنی خلیفہ) کے مقرر کیے بغیر صورت پذیر نہیں ہو سکتے' اور (قاعدہ کلیہ ہے) کہ فرض کا حصول جس چیز پر موقوف ہو اس کا حصول بھی فرض قرار پائے گا اور اس قاعدہ پر بڑے بڑے صحابہؓ نے اُمت کو متنبہ کر دیا ہے۔"

☆ اس وراثت علمی کو آگے بڑھاتے ہوئے بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ اپنی مسجع اردو میں فریضہ اقامت دین کی پرزور دعوت ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"ہر ذی شعور مسلمان کا اولین فرض ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اپنی پوری زندگی اس کی کامل اطاعت میں دے دے (جو لازماً اطاعت رسول ہی کے واسطہ سے ہوگی) اس رویے کا نام عبادت رب ہے جو کہ ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی طرف نوع انسانی کو دعوت دینے کے لیے تمام انبیاء و رسل مبعوث ہوئے اور جو از روئے قرآن جنوں اور انسانوں کا عین مقصد تخلیق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی صحت و قوت' فرصت و فراغت' صلاحیت و استعداد' مال و دولت اور وسائل و ذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' امر بالمعروف اور

نہی عن المنکر' احقاقِ حق اور ابطالِ باطل' دعوت الی اللہ اور تبلیغ دین' نصرتِ خدا اور رسول ﷺ اور حمایت و اقامتِ دین اور شہادت علی الناس اور اظہارِ دینِ حق علی الدین کلہ کے لیے وقف کر دے اور اس کے لیے محنت و مشقت' انفاق و ایثار' ترک و اختیار' ابتلاء و آزمائش' صبر و مصابرت' استقامت و مقاومت..... الغرض ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لیے مقدور بھر ہمت و عزیمت کی راہ اختیار کرے۔ یہ تمام فرائض ہر مسلمان پر حسب صلاحیت و استعداد اور مطابق وسعت و قوت عائد ہوتے ہیں[۳۶] اور ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے''۔[۳۷]

حرفِ آخر

اس مختصر مقالہ میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فرضِ کفایہ اور فرضِ عین کی بحث میں اصل خلطِ مبحث کی وجہ کچھ تو یہ بنی کہ دعوت اور فتویٰ کی زبان و اصطلاحات کو آپس میں گڈمڈ کر دیا گیا اور کچھ عمیق تر سبب یہ رہا کہ فرضِ کفایہ کی تعریف کی بابت عوام الناس میں غلط فہمی پائی جاتی ہے جس بنا پر وہ سمجھتے ہیں کہ فرضیت کے اعتبار سے فرضِ عین کوئی اہم تر فریضہ ہے اور فرضِ کفایہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس غلط اندازِ فکر کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ فرضِ کفایہ کی مثال میں عموماً نمازِ جنازہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو پورے مفہوم کی ادائیگی کے لیے ناکافی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ثابت کیا جائے کہ فرضیت کے اعتبار سے فرض کفایہ اور فرض عین میں کوئی جوہری فرق نہیں بلکہ اصل فرق مخاطبین سے واقع ہوتا ہے۔ بعد ازاں سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ وہ فرض جو اپنی اصل کے اعتبار سے کفائی ہوتا ہے وہ بعض اوقات فرض عین بن جاتا ہے' ساتھ ہی فقہاء کے کلام کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ فرضِ کفایہ میں خطابِ شرع کس کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور اس کے ترک میں کس قدر وبال ہے۔

نفس موضوع کی مناسبت سے آج مسلمانوں کی حکومتوں اور آبادیوں کا شرعی حکم نقل کیا گیا جس سے آپ سے آپ فریضہ اقامت دین ثابت ہوتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسلاف میں سے جلیل القدر ائمہ دین کی تصریحات کی روشنی میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ آج بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے دینی فرائض میں ایک عظیم الشان فریضہ اقامتِ دین کی جدّوجہد ہے۔

آخر میں احکم الحاکمین کے حضور ہم دست بدعا ہیں کہ وہ اہلِ اسلام کو اس اہم فریضہ کا شعور عطا فرمائے اور عملاً جدّوجہد کے لیے کمرِ ہمت کسنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین!

حوالہ جات

(۱) ارشاد الفحول 'روضۃ الناظر 'فواتح الرحموت۔

(۲) نورالانوار بشرح قمر الاقمار از ملا جیونؒ۔

(۳) فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت' ج ۱' ص۵۸' بحوالہ اصول فقہ ' مولانا عبیداللہ الاسعدی

(٤) فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت' ج ۱' ص ۵۸ بحوالہ اصول فقہ' مولانا عبیداللہ الاسعدی

(۵) بحوالہ اصول الفقہ مولانا عبیداللہ الاسعدی ' ص ۳۱'۳۲' مجلس نشریاتِ اسلام

(٦) اصول الفقہ ،الدکتور حسین حامد حسان' ج ۱' ص ٤٤' دار الصدق اسلام آباد

(۷) اصول الفقہ دکتور حسین حامد حسان' دارالصدق اسلام آباد، ج ۱، ص ٤٤

(۸) فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ج ۱' ص ۵۲' قدیمی کتب خانہ' کراچی

(۹) فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ج ۱' ص ۵۲' قدیمی کتب خانہ' کراچی

(۱۰) الوجیز فی اصول الفقہ' الاستاذ الدکتور وھبہ الزحیلی،ص۱۲۸، قدیمی کتب خانہ کراچی

(۱۱) الوجیز فی اصول الفقہ' الاستاذ الدکتور وھبہ الزحیلی،ص۱۲۸، قدیمی کتب خانہ کراچی

(۱۲) الوجیز فی اصول الفقہ، الدکتور سید عبدالکریم زیدان، ص٤۹، مکتبہ رحمانیہ لاہور

(۱۳) تیسیر التحریر ج ۲' ص ۳٦۳۔۳٦٤۔

(۱٤) المسودۃ ص ۳۱۔

(۱۵) الوجیز فی اصول الفقہ، الدکتور سید عبدالکریم زیدان، ص٤۹۔۵۰' مکتبہ رحمانیہ لاہور

(۱٦) اصول الفقہ' الدکتور حسین حامد حسان' ج ۱' ص ٤٤۔

(۱۷) الوجیز فی اصول الفقہ ، الاستاذ الدکتور وھبہ الزحیلی'ص ۱۲۸۔

(۱۸) رسائل و مسائل از مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ 'ج٤' ص ۲۱۲۔

(۱۹) الوجیز فی اصول الفقہ'لدکتور سید عبدالکریم زیدان ،ص ۵۰،مکتبہ رحمانیہ لاہور

(۲۰) الرسالہ ' امام شافعیؒ ص ۳٦٦' دارالمصنفین اعظم گڑھ' بھارت

(۲۱) اصول الفقہ الاستاذ حسین حامد حسان' ج ۱' ص ٤۵۔

(۲۲) فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت' ج ۱' ص ۵۳۔

(۲۳) یہاں حکومت سے مراد اسلامی ریاست یا امارت شرعیہ ہے' اندریں معنی اگر حکومت ہی نہ ہو تو حکومت کے قیام کی جدوجہد فرض کفایہ ہوگی ۔مالایتم الواجب الا بہ فھو واجب ۔ اس بات کا استدلال آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیجیے۔ (قرنی)

(۲٤) الوجیز فی اصول الفقہ، سید عبدالکریم زیدان 'ص ۵۰۔

(۲۵) بدائع الصنائع للکاسانیؒ جز اوّل۔

(۲٦) بدائع الصنائع للکاسانیؒ جز اوّل۔

(۲۷) السیاسة الشرعیه لامام ابن تیمیہؒ، ص ۱۳۸۔
(۲۸) احکام القرآن للقرطبیؒ، ج۱، ص ۲۵۱۔
(۲۹) مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۹۱
(۳۰) الملل و النحل لابن حزم، ج٤، ص ۸۷۔
(۳۱) ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء۔ از امام الهند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جلد اول، فصل اول تعریف خلافت عامہ
(۳۲) ضمناً عرض ہے کہ بعض تجدد کے حامل افراد کارکنان تحریکاتِ اسلامیہ کو یہ غلط اور خلاف حقیقت تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ''اقامتِ دین'' کی اصطلاح ہی جدید فکر کی پیداوار ہے اور بقول وحید الدین خان صاحب (بھارت والے) ''ٹین ایج'' ہے۔ جبکہ شاہ صاحبؒ جن کا سن وفات ۱۱۷٦ھ ہے، اس اصطلاح کو بڑی وضاحت کے ساتھ استعمال فرماتے ہیں۔ مزید برآں تفسیر جلالین میں ﴿كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ﴾ (النساء) کی تفسیر عاجزین عن اقدام الدین سے کی گئی ہے، اس کے علاوہ بھی کئی حوالے قدیم اسلامی لٹریچر سے فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ (قرنی)
(۳۳) ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء ۔ از امام الهند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جلد اول فصل اول تعریف خلافت عامہ
(۳٤) ایضاً۔
(۳۵) ایضاً۔
(۳٦) ''حسب صلاحیت واستعداد اور وسعت وقوت'' کے الفاظ اسی حقیقت کا اظہار ہے جسے قدیم فقہاء فرضِ کفایہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے دعوت کے پیرایۂ بیان میں فقہی نزاکت کو بڑی عمدگی سے نبھایا ہے۔ (قرنی)
(۳۷) تعارف تنظیم اسلامی، از ڈاکٹر اسرار احمد، ص ۷۹۔

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت، اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے — اشاعت عام: 15 روپے

حضرت امام مہدی

خلیفۂ اوّل — دوم — یا سوم؟

محمد نذیر یٰسین

مثل مشہور ہے کہ ''جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو مٹ جاتا ہے''۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ظلم خود بخود نہیں مٹ جایا کرتا بلکہ اسے مٹانے کے لیے ایک طاقتور و باکردار شخصیت ناگزیر ہوا کرتی ہے۔ اور یہ شخصیت بھی محض اپنی ذات کے بل بوتے پر یہ عظیم کارنامہ سرانجام نہیں دیا کرتی جب تک کہ اُسے ایک مضبوط' منظم اور اطاعت گزار جماعت میسر نہ آجائے۔ مذکورہ بالا محاورہ سے جس قائد کی ضرورت واہمیت ازخود آشکار ہوتی ہے اس کا ایک کامل مصداق مستقبل میں ظاہر ہونے والی حضرت امام مہدی کی شخصیت کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث کے درج ذیل الفاظ کے علاوہ متعدد دیگر روایات بھی اس حقیقت کا اظہار کرتی ہیں:

((يَمْلَأُ الْأَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا))(۱)

''وہ (امام مہدی) زمین کو اُسی طرح عدل وانصاف سے بھر دیں گے جیسا کہ وہ (ان کی آمد سے قبل) ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔''

لیکن حضرت امام مہدی کے متعلق واردشدہ تمام روایات سے یہ حقیقت بھی مترشح ہوتی ہے کہ وہ نہ تو انبیاء ورُسل کی طرح دعوتِ دین کی کسی تحریک کا آغاز کریں گے اور نہ ہی اس دعوت وتحریک کو پھیلانے کے لیے ایک طویل وصبر آزما جدّوجہد کریں گے' بلکہ اُن کا ظہور تو اچانک ودفعۃً ہوگا' ایک جماعت کثیر ان کی اطاعت پر آمادہ ومستعد ہوگی اور ان کی قیادت میں فتوحات پر فتوحات حاصل کرنا شروع کر دے گی۔ جبکہ ایسا ہونا نہ تو عملاً ممکن ہے اور نہ ہی تاریخی حقائق اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی آمد کی پیشین گوئیاں

''بحث ونظر'' کے عنوان سے شائع ہونے والے مضامین کے مندرجات سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں۔

تمام الہامی کتب میں موجود تھیں‘ مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی آمد پر بھی ایسا کوئی معجزہ ظہور پذیر نہ ہوا تھا کہ لوگوں نے فی الفور آپؐ کی اطاعت کرنا شروع کر دی ہو۔ وہ یہودی جو آپ ﷺ کی آمد سے قبل مشرکینِ عرب کو آپؐ کے ظہور کے حوالہ سے خبردار کیا کرتے تھے‘ انہوں نے بھی آپ ﷺ کی نہ صرف اطاعت سے انکار کیا تھا بلکہ آپ ﷺ کے بدترین دشمن بھی ثابت ہوئے تھے۔ تو پھر ظہورِ حضرت مہدی کی حقیقت کیا ہے؟ کیا صدیوں سے قائم فرسودہ ظالمانہ نظام کو یکا یک بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا حضرت مہدی کے لیے ممکن ہوسکتا ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ خلافتِ حضرت مہدی کا تعلق مستقبل کے اُس دورِ باسعادت سے ہے جسے روایات میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یعنی خلافتِ راشدہ کے دَورِ ثانی کا نام دیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت امام مہدی اُس دَورِ خلافت کے پہلے خلیفہ ہوں گے؟ یعنی یہ خلافت اُن کی جدّوجہد سے قائم ہوگی یا پھر وہ اس کے دوسرے یا تیسرے خلیفہ ہوں گے؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں درج ذیل تین بنیادی نکات کو مدِنظر رکھنا ہوگا:

(۱) ظہورِ مہدی کی روایات کے مطالعہ سے قیامِ خلافت کے حوالہ سے اُن کے کردار کا جائزہ۔

(۲) سیرت النبی ﷺ اور سیرتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روشنی میں دورِ خلافتِ راشدہ اوّل کے قیام پر غور۔

(۳) سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل میں قائم ہونے والی خلافتِ راشدہ کے قیام پر غور وخوض۔

اول الذکر کے متعلق پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ حضرت مہدی کے متعلق واردشدہ اکثر و بیشتر روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی دعوت یا تحریک شروع نہیں کریں گے بلکہ ایک خلیفہ کے انتقال پر جب اُمت اختلاف کا شکار ہو جائے گی تو منصبِ خلافت کے لیے اُنہیں موزوں ترین شخص سمجھتے ہوئے ان کی بیعت کی جائے گی‘ جیسا کہ درج ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے :

> ”ایک خلیفہ کی موت کے وقت قوم اختلاف کا شکار ہو جائے گی۔ ایک آدمی بھاگ کر مدینہ سے مکہ چلا جائے گا۔ اس کے پاس مکہ کے کچھ لوگ آئیں گے‘ اسے زبردستی باہر نکال کر رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان اُس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔“(۲)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ روایات میں جس خلیفہ کی وفات کا ذکر ہے‘ آیا وہ ایک خلیفہ راشد

ہوگا یا پھر دورِ ملوکیت کا ایک نام نہاد خلیفہ؟ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ غلامی والی ملوکیت کے ایک حکمران کو خلیفہ قرار دیں' بالخصوص جب کہ اُس کے دورِ حکمرانی کا تعلق مستقبل کی خلافتِ راشدہ کے دورِ ثانی سے بالکل متصل ہو۔ دورِ ملوکیت اور دورِ خلافت دو الگ الگ انتہائیں ہیں' جیسا کہ اُس روایت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے جس میں آپ ﷺ نے اُمت کے پانچ ادوار یعنی نبوت' خلافت علیٰ منہاج النبوۃ' ظالم ملوکیت' غلامی والی ملوکیت اور پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ' بیان کیے ہیں۔[۳] آپ ﷺ اس معاملے کو خلط ملط نہیں کر سکتے تھے' لہٰذا جس خلیفہ کی وفات کا ذکر کیا گیا ہے' معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خلیفۂ راشد ہوگا' یعنی حضرت مہدی سے پہلے اسلامی خلافت قائم ہو چکی ہوگی۔

ثانی الذکر یعنی سیرت النبی ﷺ اور سیرتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ آنحضور ﷺ ایک طویل جان گسل جدوجہد کے بعد اقامتِ دین و غلبۂ دین کے مشن میں کامیاب ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کا تمام دور بھی حقیقت کے اعتبار سے دورِ خلافت ہی تھا' اس لیے کہ آپ ﷺ خلیفۃ اللہ تھے۔ تاہم آپ کی خلافت بالفعل اُسی وقت قائم ہو سکی تھی جب آپ ﷺ کو تمکن فی الارض عطا ہوا تھا اور اسلام ایک سیاسی' معاشرتی اور معاشی نظام کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ حضرات خلفائے راشدینؓ نے تو فقط آپ ﷺ کے قائم کردہ اس نظامِ خلافت کو قائم و دائم رکھنے اور پوری دنیا پر غالب کرنے کی سعی و جُہد کی تھی۔

دورِ خلافتِ راشدہ ثانی سے قبل چونکہ دین اللہ مغلوب ہو چکا ہوگا لہٰذا اسے دوبارہ قائم و غالب کرنے کے لیے بھی آنحضور ﷺ کی طرح ایک طویل جدّوجہد کی ضرورت ناگزیر ہوگی۔ تیئیس (۲۳) برس کے عرصہ میں دین اللہ کو قائم و غالب کر دینا یقیناً نبی کریم ﷺ کا ایک عظیم معجزہ تھا' تاہم اب دوبارہ ایسا ہونا ضروری نہیں۔ اگرچہ اس کارِ عظیم کی تعمیل و تکمیل تو لازماً کسی ایک مخصوص شخصیت کے ذریعے ہی ہو سکے گی تاہم اس کے لیے زمین ہموار کرنے میں اسلاف کی تمام تر تجدیدی واحیائی مساعی کا تاریخی کردار بھی شامل ہوگا۔ بالفاظِ دیگر قیامِ خلافت کو ایک ایسی عظیم کامیابی بھی کہا جا سکتا ہے جو ماضی کی تمام ناکامیوں کے اسباب جان کر اُن کا مداوا کرنے کی صورت میں ہی حاصل ہو سکے گی۔ لہٰذا داعیانِ اسلامی انقلاب کے لیے ازبس ضروری ہوگا کہ وہ اس معاملہ میں ہونے والی ماضی کی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کا نہ صرف ادراک حاصل کریں بلکہ انہیں دُور کرنے کی بھرپور کوششیں بھی کریں۔ قیامِ خلافت میں

کامیابی اُسی وقت نصیب ہوگی جب بالکل اُسی نہج پر جدوجہد کی جائے گی جو اُمت کے پہلے حصہ کے لیے آنحضور ﷺ نے اختیار کیا تھا' جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بطور خلیفہ نامزدگی کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے درج ذیل خطبہ سے بھی یہی حقیقت مترشح ہوتی ہے:

''اے لوگو! دنیا سے ڈرو اور اس پر بھروسہ مت کرو' یہ (دنیا) دھوکے باز ہے' تم آخرت کو دنیا پر ترجیح دو اور اسے پسند کرو' کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی محبت دوسری سے نفرت کا باعث ہوتی ہے۔ یہ معاملہ (یعنی خلافت کا مسئلہ) جو اس وقت ہمارے لیے انتہائی اہم ہے' اس کا آخر بھی اسی چیز سے اصلاح پذیر ہوگا جس سے اس کے اوّل نے اصلاح پائی اور اس کی برداشت اور اس ذمہ داری کو وہی شخص نباہ سکتا ہے جو تم میں طاقت و مقدرت کے لحاظ سے بہتر ہو' جو ضبط نفس کے لحاظ سے پختہ تر ہو اور کسی بھی سختی کے وقت تأثر نہ لینے میں مضبوط ہو' یعنی اعصابی لحاظ سے طاقتور ہو' اور نرمی کے زمانہ میں وہ خوش مزاج ہو' مردم شناس ہو' اپنے اردگرد خوشامدی ٹولے سے زیادہ عقل مندوں کو ترجیح دیتا ہو۔ جس کے اوقات تعمیری ہوں اور جو اندیشہ ہائے فردا سے غم حال کی تعمیر میں منہمک ہو' جو کسی سے حصولِ علم میں حیا محسوس نہ کرتا ہو' جو اچانک حادثات میں ڈانواں ڈول نہ ہوتا ہو' جو معاشی استحکام کا ذہن رکھتا ہو' جو اپنے غصہ کی سرکشی و ظلم میں قومی دولت کی خیانت و تقصیر کا مرتکب نہ ہوتا ہو۔ اس کے ذہن میں سفر آخرت کی تیاری کے سامان کا خیال رہتا ہو اور یہ سامان آخرت اللہ کا ڈر اور اس کی اطاعت ہے اور ان تمام صفات کا حامل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہے۔''(۴)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبہ کے درج ذیل دو نکات خصوصاً قابل غور ہیں:

(۱) اس اُمت کے آخری حصہ کی اصلاح اُسی طریقہ کار کے مطابق ہوگی جو اس کے پہلے حصہ کے لیے نبی کریم ﷺ نے اختیار کیا تھا اور اُمت کے آخری حصہ کا اصلاح شدہ معاشرہ یقیناً وہی ہوگا جس میں دوبارہ نظام خلافت قائم ہوگا' یعنی حضرت مہدی' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے علاوہ دیگر اُن خلفاء کا زمانہ جن کا نام لے کر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

(۲) جس شخصیت کے ہاتھوں یہ کارنامہ سرانجام پائے گا' وہ یقیناً اُنہی صفات کی حامل ہوگی جن کا ذکر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اس خطبہ میں کیا ہے۔ ان صفات کی حامل بہترین شخصیت اُس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی لہٰذا آپؓ نے انہی کو بطور خلیفہ نامزد کیا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح ایک مضبوط اور دین و دنیا کی جامع

شخصیت کے ہاتھوں ہی قیامِ خلافت کا عمل ممکن ہو سکے گا۔

جہاں تک اُمت کے پہلے دَورِ خلافت راشدہ کا تعلق ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۃ الرسول بننے کا اعزاز حاصل کرنے والی شخصیت یعنی حضرت ابوبکر صدیق ؓ نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اسلام کی خاطر سب سے زیادہ قربانیاں دینے والے اور ہمہ وقت آپ ﷺ کی ہم نشینی کرنے والے شخص تھے۔ آپؓ کا بطور خلیفہ انتخاب ہنگامی حالات میں منعقد ہونے والی اہل اسلام کی ایک محدود نمائندہ جماعت نے کیا تھا۔ اگرچہ آپؓ کا تعلق قریش کے سب سے چھوٹے قبیلہ سے تھا تاہم اپنی خدمات وصلاحیتوں کے سبب دوسرے تمام قبائل کے لیے قابل قبول قرار پائے تھے۔ آپ ؓ کا بیشتر دَور استحکامِ خلافت کے لیے اقدامات کی نذر رہا تھا اور اس طرح آپؓ نے ہی بقیہ خلفائے راشدین کے لیے وہ بنیاد فراہم کی تھی جس پر انہوں نے نظامِ اسلامی کی ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس عظیم کارنامہ کو ہم نبی کریم ﷺ کے عملی مشن کا تکملہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے حضرت مہدی کا کردار (روایات کی رو سے) مذکورہ بالا دونوں کرداروں یعنی نبی کریم ﷺ کے کردار یعنی دعوتِ دین کا آغاز کرنے والی شخصیت کے طور پر سامنے آتا ہے اور نہ ہی حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے کردار یعنی آغاز میں ہی داعیٔ اسلام کا ہمراہی بننے والی شخصیت کے کردار کے طور پر۔ بلکہ اُن کا کردار تو ایک ایسی شخصیت کے طور پر دکھائی دیتا ہے جو کسی خاص معرکہ کے دوران ایک نمایاں کارنامہ سرانجام دینے کی وجہ سے یکا یک لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن کر اُن کی امیدوں کا مرکز ومحور بن جایا کرتی ہے جیسا کہ ثالث الذکر کے حوالہ سے ابھی بیان کیا جا رہا ہے۔

ثالث الذکر یعنی بنی اسرائیل میں قائم ہونے والی خلافت راشدہ کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیات ۲۴۶ تا ۲۵۲ میں کیا گیا ہے۔ ان میں سے ابتدائی دو آیات ملاحظہ ہوں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ

مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰی یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۝﴾

''کیا آپؐ نے موسیٰؑ کے بعد (ان کی قوم) بنی اسرائیل کے سرداروں کے معاملہ پر غور نہیں کیا؟ جب انہوں نے اپنے نبی (حضرت سیموئیلؑ) سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کر سکیں۔ انہوں نے فرمایا: کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر تم پر جنگ فرض کر دی جائے تو تم جنگ پر آمادہ نہ ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں جبکہ (صورتِ حال یہ ہے کہ) ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور اپنے بیٹوں سے بھی (جدا کر دیا گیا ہے)؟ پس جب اُن پر جنگ فرض کر دی گئی تو وہ منہ پھیر گئے سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے' اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔ اور ان کے نبیؑ نے ان سے کہا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوتؒ کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے' (اس پر) انہوں نے کہا: اُسے ہم پر بادشاہت کا حق کیونکر حاصل ہے جبکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے حق دار ہیں اور اسے تو وافر مال و دولت سے بھی نہیں نوازا گیا ہے! (نبیؑ نے) کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اُسے تمہارے اوپر چن لیا ہے اور اسے علم اور جسم میں (تمام لوگوں سے) بڑھایا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی حکومت و بادشاہت عطا کرتا ہے' اور اللہ بڑی وسعت والا' علم والا ہے۔''

آیات درج بالا اور بائبل کے مطالعہ سے بنی اسرائیل میں قائم ہونے والی خلافت راشدہ (حضرت طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کی خلافت) کے متعلق درج ذیل اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) اس خلافت کا قیام اُسی وقت ممکن ہو سکا جب بنی اسرائیل انتشارِ باہمی کا شکار تھے اور اسی بنا پر اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مسلسل ہزیمت کا شکار ہو رہے تھے۔

(۲) سردارانِ بنی اسرائیل اُس وقت ہی ایک مرکزی حکومت کے قیام پر متفق ہو سکے تھے جب اُن پر ایک مرکزی حکومت کے قیام کی اہمیت و ضرورت پوری طرح واضح ہوئی تھی۔

(۳) سردارانِ بنی اسرائیل نے اُس وقت کے نبی حضرت سیموئیلؑ سے درخواست کی تھی کہ وہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں۔

(۴) حضرت سیموئیلؑ نے جب باذن اللہ جناب طالوت کو خلیفہ مقرر کرنے کا اعلان کیا تو سردارانِ بنی اسرائیل نے طالوت کی معاشی حالت کو کمزور سمجھتے ہوئے اور خود کو اُن سے فائق خیال کرتے ہوئے اپنا استحقاق جتلایا تھا۔ گویا سردارانِ بنی اسرائیل کے نزدیک کسی شخص کی فضیلت کا معیار اُس کا معاشی طور پر خوشحال ہونا تھا' جیسا کہ یہی معیارِ فضیلت آج ہمارے ہاں بھی برقرار ہے۔

(۵) بنی اسرائیل کے سرداروں کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے حضرت سیموئیلؑ نے استحقاقِ خلافت کے جو معیارات بیان فرمائے' وہ تھے علم اور جسمانی صحت و تندرستی میں دوسروں پر فوقیت۔ یہاں علم سے مراد محض علم دین نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو خود حضرت سموئیلؑ نبی ہونے کے ناطے حضرت طالوت پر فوقیت رکھتے تھے' لہٰذا یہاں دین اور دنیا دونوں کا علم مراد ہے۔ گویا حضرت طالوت دین اور دنیا دونوں کا علم رکھنے والی ایک جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ اسی طرح یہاں جسمانی طور پر مضبوط ہونے سے مراد ایک مضبوط ڈیل ڈول والی کڑیل شخصیت مراد نہیں بلکہ مضبوط اعصاب کا مالک ہونا مراد ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک نحیف و نزار جسم کے مالک ہونے کے باوجود ہمارے پہلے خلیفہ راشد قرار پائے تھے اور جیسا کہ اُن کے خطبہ سے بھی یہی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

(۶) حضرت طالوت کا تعلق بنیامین کے قبیلہ سے تھا جو بنی اسرائیل کا سب سے چھوٹا قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل اور اُمتِ مسلمہ کے پہلے خلفائے راشدین کے مابین ایک معنی خیز مماثلت یہ ہے کہ دونوں کا تعلق اپنی قوم کے سب سے چھوٹے قبیلوں سے تھا۔ تاریخ میں ایسی اور بھی مثالیں ملتی ہیں کہ مختلف قبائل اور گروہوں میں بٹی ہوئی قومیں ایک سب سے چھوٹے قبیلہ یا گروہ کے کسی باصلاحیت شخص کی بدولت بنیانِ مرصوص بن کر سامنے آئیں اور اقوامِ عالم میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کرنے کا سبب بنیں۔

سب سے چھوٹے گروہ کے شخص کو مرکزِ ملت بنا لینے کی ایک معقول وجہ یہ بھی سامنے آتی ہے کہ اُس کے مفادات کا دائرہ دوسروں سے کمتر ہونے کی بنا پر اُس کی طرف سے دوسروں کے غیر ضروری استحصال کے امکانات سب سے کم ہوا کرتے ہیں۔

(۷) بنی اسرائیل اور اُمتِ مسلمہ کی خلافت ہائے راشدہ کے مابین ایک اہم ترین فرق یہ نظر

آتا ہے کہ اُمتِ مسلمہ میں نظام خلافت اُمت کے مؤسس اوّلین داعی وشارع حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہی قائم ہو گیا تھا جبکہ بنی اسرائیل میں صورتحال اس سے مختلف نظر آتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے شارع حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بحیثیتِ نبی حضور اکرم ﷺ کی طرح خلیفۃ اللہ فی الارض تھے لیکن نبی کریم ﷺ کی طرح اُنہیں ایک ایسی اطاعت گزار جماعت صحابہؓ میسر نہ آسکی تھی جو نظام خلافت قائم کرنے میں اُن کی ممد ومعاون ثابت ہوتی۔ بنی اسرائیل میں وہ نظام مملکت یا نظام خلافت قائم نہ ہو سکا تھا جو آنحضور ﷺ اپنے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے قائم کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ پس ثابت ہوا کہ آنحضور ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں سیاسی وروحانی دونوں خلافتیں یکجا ہو گئیں تھیں جبکہ حضرت موسیٰؑ اور اُن کے خلفاء یہ سعادت حاصل نہ کر سکے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضرت طالوت کی خلافت سے پہلے کے درمیانی عرصہ کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں دورِ قضا کا نام دیا گیا ہے جس میں انبیاء بنی اسرائیل اپنی قوم کو دینی تعلیمات دینے کے علاوہ کچھ شرعی فیصلے بھی نبٹاتے رہتے تھے تاہم مجموعی طور پر سیاسی قیادت مختلف قبائل کے سرداروں کے پاس ہی رہی تھی۔ یہ قبائل آپس میں دست وگریبان ہونے کے علاوہ اپنے دشمنوں کا تختۂ مشق بھی بنتے رہتے تھے جس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اپنی ایک مرکزی حکومت قائم نہ کی تھی جو ان کے تمام مسائل حل کرنے کے علاوہ اُنہیں دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا کام بھی دیتی۔ دین اور دنیا کی یہ تفریق اُن کے درمیان ایک طویل عرصہ تک چلتی رہی جس کی وجہ سے حالات بنی اسرائیل کے لیے دن بدن ناموافق ہوتے گئے اور دشمن اُن پر دن بدن غالب آتے چلے گئے۔ یہ قبائل دشمنوں کے خلاف اپنے اپنے وسائل وطریقۂ کار کے مطابق تو برسر پیکار رہے تاہم ایک مرکزی حکومت یعنی خلافت کے قیام سے بھی گریز جاری رکھتے رہے جس کا سبب اپنی اپنی بڑائی کا زعم اور ایک دوسرے پر عدم اعتماد ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

جب حالات حد سے زیادہ گھمبیر ہو گئے اور ایک مرکزی حکومت کے قیام کی ضرورت خوب آشکار ہو چکی تو انہوں نے نبیٔ وقت حضرت سیموئیلؑ سے عرض کی کہ ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف ایک مشترکہ جہاد کر سکیں۔

(۸) یہاں ایک اور نکتہ قابل غور ہے کہ بنی اسرائیل شعوری یا لاشعوری طور پر خلیفہ کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کر رہے تھے‘ حالانکہ دین اللہ کا منشاء ومقصود قیامِ خلافت ہے نہ کہ بادشاہت۔ مزید برآں وہ جہاد فی سبیل اللہ بھی صرف اپنے اوپر حملہ آور دشمنوں کے خلاف لڑنا ہی سمجھ رہے تھے‘ حالانکہ اصل جہاد تو دین اللہ کے قیام وغلبہ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ محض اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے۔ بالکل یہی صورتحال آج اُمّتِ محمدیہ کو بھی درپیش ہے۔ اس اُمت کی اکثریت بھی خلافت کے بجائے مروّجہ جمہوریت کو پسند کرتی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں بھی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا شکار ہے۔ محض اپنی مدافعت کے لیے ہی جہاد کو جائز سمجھنا اس اُمت کا بھی مسئلہ بن چکا ہے۔

المختصر جب کافی لیت ولعل اور قیل وقال کے بعد بنی اسرائیل کے تمام قبائل نے متفقہ طور پر حضرت طالوت کو بطور خلیفہ قبول کر لیا تو انہوں نے اپنے دشمنوں کے خلاف ایک منظم ومربوط جہاد کا آغاز کیا۔ اسی مرحلۂ جہاد کے دوران ایک اہم معرکہ میں حضرت داوٗد علیہ السلام کی شخصیت اچانک اُبھر کر سامنے آئی جنہوں نے دشمن کے سب سے بڑے اور ناقابل شکست سمجھے جانے والے کمانڈر جالوت کو ایک انوکھی تدبیر کے ذریعے قتل کرنے کا کارنامہ سرانجام دے کر بنی اسرائیل کے دل جیت لیے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعدازاں اُنہیں شرفِ نبوت کے علاوہ حضرت طالوت کی دامادی وجانشینی کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

راقم کے خیال میں یہی معاملہ مستقبل میں ظاہر ہونے والے حضرت امام مہدی کا ہے۔ اُن کے ظہور سے پہلے خلافت ان شاء اللہ قائم ہو چکی ہوگی اور اس دَورِ خلافت کے دوران ہی حضرت مہدی‘ محمد یا احمد بن عبداللہ کے اپنے حقیقی نام کے تحت اپنے کسی خاص کارنامہ کی بنا پر مشہور ومعروف ہو جائیں گے۔ روایات میں بیان کی گئی علامات کی وجہ سے اپنے اور پرائے سب جان جائیں گے کہ مستقبل کا امام مہدی یہی شخص ہے۔ اب دشمن ان کی جان کے درپے ہو جائیں گے جس کی وجہ سے وہ عارضی طور پر روپوش ہو جائیں گے‘ جیسا کہ بعض روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بار ظہور کے بعد منظرِ عام سے غائب ہو جائیں گے۔ خلیفۂ وقت کے انتقال کے بعد اُن کا دوبارہ ظہور بیت اللہ میں اُس وقت ہوگا جب اہل ایمان کی ایک تعداد اُنہیں پہچان لے گی اور منصبِ خلافت سنبھالنے پر رضامند کر لے گی اگرچہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرنا نہ چاہتے ہوں گے۔

حضرت امام مہدی کی اس عارضی نوعیت کی غیوبیت کی کچھ روایات کی وجہ سے ہی غالباً اثنا عشری فرقہ نے امام غائب کا عقیدہ تراش رکھا ہے۔ بالکل اسی طرح کا معاملہ تحریک مجاہدین کے امیر حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ ہوا تھا۔ بالاکوٹ کے آخری معرکہ میں چونکہ ان کی میت کی مکمل شناخت نہ ہو سکنے کی وجہ سے معاملہ قدرے مشتبہ ہو گیا تھا لہٰذا اُن کے بعض متبعین و مریدین نے اُنہیں امام مہدی خیال کرتے ہوئے ان کی عارضی غیوبیت اور دوبارہ ظہور کا فسانہ گھڑ لیا تھا۔

ظہورِ مہدی کا معاملہ اگر ایسا ہی ہو جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تو ان کے ظہور سے قبل ایک یا دو خلفاء کی خلافت کا انعقاد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ حضرت مہدی کے پیش رو خلفاء دو ہوں گے۔ پہلا خلیفہ وہ ہوگا جس کی جدوجہد کے نتیجہ میں نظامِ خلافت قائم ہوگا جبکہ دوسرا وہ جو قیام و انعقادِ خلافت میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ اس دوسرے خلیفہ کے بعد اختلاف پیدا ہو جائے گا جس کا خاتمہ حضرت مہدی کے ذریعے ہی ہو سکے گا۔ جس طرح اُمت کے پہلے دَورِ خلافت میں نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی سمیت پانچ خلفاء تھے' اُسی طرح اُمت کے دوسرے دَورِ خلافت میں بھی پانچ ہی خلفاء ہوں گے جن میں سے تین کے نام روایات میں بیان کر دیئے گئے ہیں' یعنی بالترتیب حضرت امام مہدی' حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مقعد' جبکہ ان سے قبل کے دو خلفاء کے معاملہ کو صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے' جس کی وجوہات آخر میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

بہت سے قارئین کے ذہنوں میں یہ سوال اُٹھ چکا ہوگا کہ خلافت راشدہ ثانی کا قیام و انعقاد کیونکر ممکن ہو سکے گا جبکہ حال یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کئی براعظموں پر پھیل چکی ہے' لاتعداد فرقوں اور گروہوں میں بٹ چکی ہے اور مختلف ریاستوں میں اسے تقسیم کر دیا گیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے درج ذیل نکات کو مدّنظر رکھنا ہوگا:

(۱) قیامِ خلافت کی عملی ابتدا کسی ایک مخصوص خطہ زمین سے ہی ممکن ہو سکتی ہے' جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے پہلے جزیرۃ العرب کی سرزمین پر ہی نظامِ خلافت قائم کیا تھا جہاں سے یہ نظام باقی دنیا تک پھیل گیا۔ اس سے یہ حقیقت بھی مترشح ہوتی ہے کہ قیامِ خلافت کی جدّوجہد کرنے والے شخص کا اوّلین ہدف اس کی اپنی قوم ہونی چاہیے۔

(۲) قیامِ خلافت کی طرف عملی پیش رفت اُسی وقت ممکن ہو سکے گی جب نظامِ خلافت کے کسی

داعی کو کچھ مضبوط گروہوں کی عملی تائید و نصرت حاصل ہو جائے گی' جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ابتدائی طور پر مدینہ کی ایک چھوٹی اسلامی ریاست کا قیام اُسی وقت ممکن ہو سکا تھا جب اوس اور خزرج کے دو اہم قبائل مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ دین اللہ کے انصار بننے والے یہ گروہ داعی خلافت کے اپنے ہم قوم بھی ہو سکتے ہیں اور دیگر اقوام میں سے بھی۔

(۳) چونکہ آج اُمت محمدیہ ﷺ بنی اسرائیل کی طرح منتشر و منقسم ہو چکی ہے لہٰذا قیام خلافت کے آخری مرحلے یعنی انعقاد خلافت کے لیے ہمیں تاریخ بنی اسرائیل سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ بعض حضرات کا یہ کہنا کہ مسلمان اس حد تک تقسیم ہو چکے ہیں کہ اب ان کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا ہو ہی نہیں سکتا' ہرگز درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر بنی اسرائیل اپنی پراگندگی و انتشار کے باوصف حضرت طالوت کی قیادت پر متفق ہو سکتے ہیں تو خیرِ اُمت کہلانی والی یہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کیسے بانجھ قرار دی جا سکتی ہے؟

(۴) اتحادِ اُمت کے لیے ایک ایسی شخصیت ناگزیر ہوگی جسے مسلم معاشرہ کے بیشتر طبقاتِ فکر اور فقہی مسالک کا اعتماد حاصل ہو۔ ایک ایسی شخصیت جسے دینی تعلیم سے بہرہ ور طبقات اور جدید عصری علوم کے ماہر دونوں طبقات اپنا رہنما تسلیم کر سکتے ہوں۔ جو صداقت و امانت کی صفات سے متصف ہو اور اپنی منتشر و پراگندہ قوم کو دوبارہ ایک لڑی میں پرو کر انہیں اپنے دشمنوں کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہو۔ اس معاملہ میں نبی کریم ﷺ کی قبل از نبوت زندگی کا وہ واقعہ ایک رہنما مثال بن سکتا ہے جب آپ ﷺ نے کمالِ فراست سے کام لیتے ہوئے تمام قبائل عرب کو متحد رکھنے کی غرض سے حجرِ اسود کو ایک چادر پر رکھ کر تمام قبائل کے سرداروں کو اسے اٹھانے میں شریک کار کر لیا تھا۔ خلافت کا استحقاق رکھنے کے باوجود قیامِ خلافت میں تمام طبقات و مکاتب فکر کو اس کارِ خیر میں حصہ دار بنا لینے کی صلاحیت رکھنے والا شخص ہی اس اُمت کو ایک وحدت میں پرو سکتا ہے۔ برصغیر میں متعدد ایسی مثالیں موجود ہیں جب یہاں کی تمام دینی قوتوں نے کسی خاص مسئلہ پر یکساں موقف و لائحہ عمل اختیار کرتے ہوئے مشترکہ تحریک برپا کی ہو۔ اس ضمن میں خلافت عثمانیہ کے حق میں چلائی جانے والی

تحریکِ خلافت' قیامِ پاکستان کے بعد ایک اسلامی دستور کی خاطر بائیس مشترکہ نکات پر اتفاقِ رائے' فتنہ قادیانیت کے خلاف مشترکہ جدّوجُہد' ۱۹۷۹ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ' دفاعِ پاکستان و افغانستان کونسل کے نام سے ایک مشترکہ محاذ کا قیام اور بعدازاں اسی کونسل کا متحدہ مجلس عمل کی شکل اختیار کرنا وغیرہ جیسی مثالیں بیان جا سکتی ہیں۔ ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ جب قیامِ خلافت کا وقت آئے گا تو یہاں کی دینی قوتیں باہم متحد و متفق ہو کر اس جدّوجہد میں اپنا کردار ادا کریں گی۔

(۵) نظامِ خلافت کے بالفعل قیام کی طرف عملی پیش رفت میں کوئی معروف' جیّد' ثقہ اور صاحبِ عزیمت عالم دین کا بھی ایک اہم کردار ہوگا۔ یہ عالم دین دینی قوتوں کو ایک معین شخص کی بیعت کر لینے اور اُسے خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لینے کا مشورہ دے گا۔ اس امر کی تصدیق حضرت طالوتؒ و حضرت سیموئیلؑ کے قصہ سے تو ہوتی ہی ہے' نبی کریم ﷺ سے منسوب یہ فرمان بھی اس کی تصدیق کرتا ہے کہ ((عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ))(۵) ''میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہوں گے۔''

تاریخ برصغیر کے درج ذیل دو اہم واقعات بھی اسی حقیقت کی تائید کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے حضرت شاہ اسماعیلؒ کا ہے جنہوں نے ایک بڑے عالم دین ہونے کے باوصف مجاہدِ کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ (جو مروّجہ معیارات کے مطابق ایک عالم دین نہ تھے) کی نہ صرف بیعت کی بلکہ اُن کی تحریک میں بھرپور عملی حصہ لیتے ہوئے جامِ شہادت بھی نوش کیا۔ شاہ صاحبؒ کے اس غیر معمولی اقدام کو آدم و ابلیس کے مابین جاری معرکۂ خلافت (جو درحقیقت عجز و کبر کے مابین ایک ابدی مقابلہ ہے) میں حضرت انسان کی ایک اور اہم فتح قرار دیا جا سکتا ہے۔ صرف اس حقیقت کو سمجھ لینے سے ہی حضرت شاہ صاحبؒ کی عظیم شخصیت کو مسخ و مجروح کرنے کی مذموم شیطانی کوششوں کا سراغ مل سکتا ہے۔

دوسرا واقعہ ریشمی رومال تحریک کے روحِ رواں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ہے جنہوں نے اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں کو مروّجہ معیارات کے مطابق ایک غیر عالم دین سیاسی شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی بیعت کر لینے کی وصیت کی تھی۔ اُن کی اس وصیت پر اگرچہ بوجوہ عمل درآمد ممکن نہیں ہو سکا تھا تاہم یہ بات بالکل عیاں ہے کہ انہوں نے حضرت سیموئیلؑ اور حضرت شاہ اسماعیل رحمہ اللہ کے نقوشِ قدم کی ہی پیروی کی تھی۔

(۶) غالب امکان ہے کہ حضرت طالوت اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح خلافت کے لیے نامزد ہونے والے شخص کا تعلق کسی چھوٹی جماعت سے ہی ہوگا تاہم اپنی غیر معمولی جدوجہد‘ بے داغ کردار‘ متوازن شخصیت اور دیگر اوصاف کی بناء پر اس کا حلقہ اثر بہت وسیع ہو جائے گا جس کی بنا پر وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول بن جائے گا۔

(۷) جو شخص قیامِ خلافت کی جدّوجہد کرے گا‘ اُسے لازماً مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑے گا کہ قیامِ خلافت کی جدّوجہد درحقیقت رائج الوقت باطل و فرسودہ نظام کے خلاف ایک اعلانِ بغاوت ہوگی جس کا ردّعمل بھی لازماً سامنے آئے گا۔ سید احمد شہیدؒ کی جدّوجہد پر ہی نظر دوڑا لیجیے۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اُن کی ناکامی میں غیروں سے زیادہ اپنوں نے کردار ادا کیا تھا۔ نظامِ خلافت کے داعی کو چونکہ اپنی ہی قوم کے اندر اس کی جدوجہد کرنا ہوگی لہٰذا کامیابی اس کا مقدّر تب ہی بن سکے گی جب وہ اپنی توجہ صرف اور صرف نظام اسلام کے قیام پر مرکوز رکھے گا۔ اپنے خلاف ہونے والی تمام تر مخاصمانہ کارروائیوں (خواہ وہ زبانی ہوں‘ تحریری ہوں یا عملی شکل میں ہوں) کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے گا اور ترکی بہ ترکی اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی پالیسی سے احتراز کرے گا۔ اُسے اپنا دفاع ایسے احسن طریقہ سے کرنا ہوگا کہ اس کی مخالفت میں پیش پیش رہنے والے اشخاص یا گروہ بھی بالآخر اُس کے حسن اخلاق اور کارناموں سے متاثر ہو کر اس کے حامی و مددگار بن جائیں گے۔ قرآن حکیم کی درج ذیل آیات میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

”اور اُس شخص سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہوگی جو (صرف اور صرف) اللہ ہی کی طرف بلائے اور کہے کہ میں تو فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور اچھائی و برائی برابر نہیں ہوسکتیں‘ پس (اے نبی ﷺ) آپ اپنی مدافعت کیجئے ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو‘ پھر ایک وقت آئے گا کہ جب آپ کے اور آپ کے مخالف کے مابین موجود

عداوت ایسی حالت میں بدل جائے گی کہ وہ آپ کا پکا دوست و مددگار بن جائے گا۔
اور یہ مقام و مرتبہ نہیں حاصل کر سکتے مگر وہی لوگ جو ثابت قدم رہنے والے ہیں‘ اور یہ
شرف نہیں حاصل کر سکتے مگر وہی لوگ جو انتہائی خوش قسمت ہیں۔‘‘

مقامِ خلافت یقیناً ایک بہت بڑی ذمہ داری کے علاوہ ایک بہت بڑا اشرف بھی ہے جو اُسی شخص کا مقدر ہوسکتا ہے جو آیات درج بالا کا عملی مصداق بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ صبر و تحمل اور حسن اخلاق کا مظاہرہ صرف ناموافق حالات میں ہی کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو بلکہ اُس وقت بھی اسی کردار کا مظاہرہ کرسکتا ہو جب وہ ایک فاتح و کامران کی حیثیت سے اپنے مخالفین سے مخاطب ہو اور پھر انہیں ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ کے رحمدلانہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اُن سے درگزر فرما سکے‘ جیسا کہ آنحضورﷺ نے سُنّتِ یوسفیؑ پر عمل کرتے ہوئے فتح مکّہ کے بعد اپنے مخالفین کو یہی الفاظ ادا کرتے ہوئے معاف فرما دیا تھا۔ پس جو رہنما اعلیٰ ترین اخلاق و کردار کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہے گا‘ اُس کے لیے نصرتِ الٰہی کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے‘ حالات دن بدن اس کے موافق ہوتے چلے جائیں گے اور بالآخر وہ مرحلہ آن پہنچے گا جب وہ تمام قوتیں جو قبل ازیں اس کی تحریک و دعوت کے خلاف مصروفِ عمل تھیں‘ اُس کے مکمل تصرف و اختیار میں آ جائیں گی‘ جنہیں وہ بکمال حکمت سے کام میں لاتے ہوئے رب کی دھرتی پر رب کا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا‘ ان شاء اللہ العزیز!!

(۸) مقامِ نبوت کی طرح مقامِ خلافت کو ایک وہبی چیز قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ازروئے قرآن خلافت موعود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں سے اس کا وعدہ کر رکھا ہے جو ایمان اور عمل صالح کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی ہمت و صلاحیت بھی رکھتے ہوں‘ جیسا کہ قرآن حکیم کی درج ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي
الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي
ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ
شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ (النور)

’’اللہ نے وعدہ کرلیا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے کہ وہ لازماً انہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا جیسا کہ اس نے اُن

لوگوں کو خلافت عطا کی جو ان سے پہلے ہو گزرے' اور وہ لازماً اُن کے لیے ان کے اُس دین کو تمکّن عطا فرمائے گا جو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے' اور وہ لازماً ان کی موجودہ حالتِ خوف کو امن میں تبدیل کر دے گا' (پھر اُس وقت وہ صرف) میری ہی (کامل) بندگی کریں گے اور میرے ساتھ (عقائد' عبادات اور معاملات وغیرہ میں) کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو کوئی اس کے بعد بھی کفر کی روش ہی اختیار کرے گا تو وہی لوگ (حقیقی) نافرمانوں میں سے ہوں گے۔"

آیت درج بالا میں اُس گروہ کا بیان ہوا ہے جو ایمان اور عمل صالح کا واقعی حق ادا کرے گا' یعنی ان کے اعلیٰ ترین مقامات تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ جب وہ مقامِ مطلوب تک پہنچے گا تب ہی بارگاہ الٰہی میں خلافت کا سزاوار بن سکے گا۔ جو لوگ عزیمت کی بجائے رخصت و مصلحت کوشی کی روش اختیار کریں گے اُن کے لیے دنیا کا چار روزہ اقتدار و حکومت تو مقدّر ہو سکتی ہے مگر وہ خلافت ہرگز نہیں جو عند اللہ ابنِ آدم کے لیے مطلوب و مقصود ہے۔

درج بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مہدی کے ظہور سے پہلے نظامِ خلافت قائم ہو چکا ہوگا اور اُن کے پیشرو ایک یا دو خلفاء ہی اس کے لیے زمین ہموار کریں گے۔ ان پیشرو خلفاء میں سے اول کی جدّ و جہد قیامِ خلافت کے لیے اور دوسرے کی اس نظامِ خلافت کو مستحکم کرنے میں صرف ہو جائے گی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اور ان کے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زیادہ تر جدوجہد قیامِ خلافت اور استحکامِ خلافت کی نذر ہو گئی تھی اور اسلام کا کامل عادلانہ نظام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دَور میں ہی قائم ہو سکا تھا۔ خلافتِ راشدہ کے دَورِ ثانی میں اسلام کا کامل عادلانہ نظام حضرت مہدی کے دَور میں ہی قائم ہو سکے گا۔ روایات میں عدل و قسط کے حوالہ سے حضرت مہدی کا ذکر اسی تناظر میں کیا گیا ہے' واللہ اعلم!

باقی رہے یہ سوالات کہ حضرت مہدی کے پیش رو خلیفہ یا خلفاء کا نام اور قیامِ خلافت کی صراحت روایات میں کیوں نہیں کی گئی ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہی تو دراصل ذرّیتِ آدم میں سے خیرِ اُمّت کہلانے والی اُمّتِ محمدیہ ﷺ کا (بالعموم) اور اس اُمت کے اندر خدمتِ دین کے حوالہ سے سرگرم عمل دینی قوتوں کا (بالخصوص) امتحان ہے۔ اُمت کے لیے مرکزیت یعنی خلافت کی ضرورت کا احساس کرنا' اس کے لیے جدوجہد کرنا' اپنی اپنی انا کو قربان کرنا' اپنے اپنے ذاتی و طبقاتی مفادات کو بالائے طاق رکھنا اور ایک موزوں ترین شخص کو اپنا خلیفہ

منتخب کرنا ہی دینی قوتوں کا حقیقی امتحان ہے جس میں وہ ان شاء اللہ ضرور سرخرو ہوں گی۔

اس حقیقت سے تو سبھی بخوبی واقف ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی وفات کے بعد خلافتِ راشدہ اوّل کے قیام کی صرف خبر ہی دی تھی حالانکہ آپ ﷺ اپنے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بالترتیب اپنے تمام خلفاء کے نام اور یا پھر اُن کے انتخاب کا محفوظ ترین طریقۂ کار بھی بتا سکتے تھے۔ اگر آپ ﷺ نے ایسا کیا ہوتا تو نہ روافض اور خوارج وغیرہ کے فرقے وجود میں آتے اور نہ ہی حضرات صحابہ کرامؓ کے مابین اختلافات ونزاعات کی نوبت آتی۔ یقیناً یہ سب کچھ اُن کے لیے امتحان تھا جس میں وہ کامیاب رہے تھے۔ صحابہ کرامؓ کی طرح نظام خلافت کو قائم کرنا اب اُمتیوں کا امتحان ہے اور یقیناً وہ اس میں کامیاب ہو کر رہیں گے' لیکن یہ کام محض معجزات وکرامات کے ذریعے نہیں بلکہ انسانی کاوشوں کے ذریعے ہی ممکن ہو سکے گا۔ نبی کریم ﷺ نے آخری زمانہ کے جس گروہ کو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سا اجر وثواب ملنے کی خوشخبری دی ہے' وہ یقیناً وہی گروہ ہوگا جو حضرات صحابہ کی طرح ایمان کے تقاضے پورا کرے گا اور انہی کی طرح دین اللہ کا انصار بن کر نظام خلافت کے قیام کی کامیاب جدّوجہد کرے گا۔

حضرت مہدی کے پیش رو خلفاء کے نام اور قیام خلافت کے مراحل کی تفاصیل نہ بیان کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ قیام خلافت کے اس اہم ترین کام کو محفوظ و مامون طریقہ سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اس کے ابتدائی مرحلہ کی زیادہ تفاصیل بیان نہ کی جائیں' واللہ اعلم بالصواب۔ اس حوالہ سے یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ سابقہ الہامی کتب میں نبی کریم ﷺ کی ہجرت کے مقام کا ذکر تو موجود تھا مگر مقام پیدائش وغیرہ کی تفاصیل موجود نہ تھی۔

حواشی

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب المھدی' عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔

(۲) سنن ابی داوٗد' کتاب المھدی' عن اُم سلمۃ رضی اللہ عنہا۔

(۳) مسند احمد' کتاب مسند اوّل الکوفیین' رقم ۱۷۹۳۹' عن نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ۔

(٤) بحوالہ حیات الصحابہؓ از مولانا محمد یوسف کاندھلوی' بعنوان من یحتمل الخلافۃ۔

(٥) اسے ملا علی قاریؒ نے الاسرار المرفوعۃ میں' محدث زرقانیؒ نے مختصر المقاصد میں اور امام البانیؒ نے السلسلۃ الضعیفۃ میں نقل کیا ہے۔ اکثر ائمہ حدیث نے اس کے بارے میں لکھا ہے: لا اصل لہ۔ البتہ محدث محمد بن محمد الغزیؒ نے لکھا ہے: لہ شواھد۔ (ادارہ میثاق)

حضرت مولانا آصف قاسمی حفظہ اللہ

دینی خدمات- اور- خیالات ونظریات

انٹرویو کے آئینے میں

انٹرویو پینل: اویس پاشا قرنی، مولانا سعید الحسن الحسینی

گزشتہ دنوں حضرت مولانا آصف قاسمی دامت برکاتہم کینیڈا سے کراچی تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس دوران آپ نے کمال التفات کے ساتھ تنظیم اسلامی کراچی کے تحت منعقد ہونے والی شریعت کانفرنس میں بطور مقرر شرکت فرمائی اور اظہارِ خیال فرمایا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت سے انٹرویو کے لیے وقت مانگا گیا، جس پر آپ نے بڑی آمادگی کے ساتھ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود وقت دیا۔ اس پر ہم حضرت قاسمی صاحب کے بہت ممنون ہیں۔ یہ معلوماتی انٹرویو قارئین میثاق کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

س: آپ کا تعلق برصغیر پاک وہند کے ایک عظیم دینی علمی گھرانے سے ہے، البتہ اگر آپ ہمارے قارئین کے لیے اپنے خاندانی وتعلیمی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالیں تو یقیناً مفید رہے گا۔

ج: دراصل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی مدرسہ دیوبند میرے پردادا تھے، ان کے ایک صاحبزادے تھے حافظ محمد احمدؒ جو اپنی علمی شہرت رکھتے تھے۔ حافظ محمد احمد صاحب کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام ہے مولانا قاری محمد طیبؒ قاسمی، جو میرے تایا ہیں اور ان کے چھوٹے بھائی ہیں مولانا طاہر قاسمیؒ۔ قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند تھے۔ میں مولانا طاہر قاسمیؒ کا بیٹا ہوں، اس اعتبار سے میرے پردادا ہوئے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ صاحب۔ دیوبند کے اندر ہی میری پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی اور موقوف علیہ تک میں وہیں پڑھتا رہا، دورۂ حدیث سے پہلے پہلے دیوبند ہی کے اندر میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی، جہاں میں نے فارسی پڑھی، عربی کی ابتدائی کتابیں

پڑھیں۔ مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ کے بیٹے مولانا اسعد مدنی میرے سب سے پہلے استاد ہیں' ان سے میں نے میزان منشعب وغیرہ پڑھی۔ مولانا سالم صاحب بھی میرے چچازاد بھائی ہیں' جو آج کل دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ' مولانا اختر حسینؒ یہ سب میرے اساتذہ ہیں۔ اس کے بعد میں کراچی آ گیا اور مولانا محمد یوسفؒ بنوری کے مدرسہ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں دورۂ حدیث میں داخلہ لیا اور یہیں سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے مجھے روک لیا اور دو سال میں نے مزید لگائے۔ مفتی اعظم پاکستان مفتی ولی حسن ٹونکیؒ صاحب کو میرا استاد مقرر کیا' تاکہ مجھے تحریر و تقریر سکھائیں۔ جامعہ میں تخصص فی الفقہ کے نام سے آج کل جو مستقل شعبہ ہے اس کا آغاز مجھ ہی سے ہوا۔ لوگوں کے استفتاء کے جوابات دینے کے لیے مجھے مقرر کیا گیا اور دو سال تک مجھے اس میں بھی کافی سیکھنے کو ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ بنوری صاحب نے تورات' زبور' انجیل اور شیعوں کی کتاب اصول کافی اور نہج البلاغہ بھی پڑھائی۔ بنوری صاحب فرمایا کرتے تھے کہ سب پر نظر ہونی چاہیے۔ میں ۱۹۶۰ء میں تعلیم سے فارغ ہوا۔

س : آپ ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی کب تشریف لائے؟

ج: ہم تو ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء میں یہاں آئے ہیں' دراصل تعلیم کی تکمیل کے لیے دیوبند رکنا پڑا۔ ۱۹۵۹ء میں دارالعلوم فاروق اعظم نارتھ ناظم آباد کی بنیاد رکھی گئی اور اسی سال ہم نے انٹرنیشنل محفل حسن قراءت کا پروگرام رکھا جو بہت سراہا گیا۔ اس میں ہم نے قاری عبدالباسط صاحب کو مصر سے بلایا تھا' کچھ نے اختلاف بھی کیا تھا' مگر اس کے بعد تو دوسرے مدرسے والوں نے بھی یہ سلسلہ شروع کر دیا۔ جب ہم نے دارالعلوم فاروق اعظم کی بنیاد رکھی تھی اُس وقت یہاں شیعہ حضرات بھی تھے اور شیعہ سنی دونوں میں بڑی آنکھ مچولی ہوتی تھی' کبھی اس نے پتھر مار دیا اور کبھی انہوں نے پتھر مار دیا' پولیس والے کبھی اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور کبھی ان کے پیچھے۔ بہر حال یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ آخر کار ایوب خان نے اس کا فیصلہ کیا۔ دربار علی شاہ کراچی کے کمشنر تھے۔ فائیو اسٹار چورنگی پر شیعوں کو جگہ دی گئی اور نارتھ ناظم آباد بلاک K میں یہ قطعہ زمین ہمیں دیا گیا۔ لوگوں میں بڑا جوش خروش تھا کہ ہماری مسجد بن گئی۔ دراصل وہی بات ہے کہ ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

س: آج آپ ماشاء اللہ' دو بڑے تعلیمی ادارے چلا رہے ہیں' ایک پاکستان میں دارالعلوم فاروق اعظم اور ایک کینیڈا میں جامعہ اسلامیہ کینیڈا۔ ان کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں۔

ج: ۱۹۵۹ء میں یہ جگہ ہمیں مل گئی تھی۔ اُس وقت یہاں کوئی آبادی ہی نہیں تھی' دور دور تک خالی ویران جگہیں تھیں' مشکل سے ایک دو نمازی آتے تھے۔ میں پاپوش میں رہتا تھا اور وہاں سے اپنی گاڑی پر آتا تھا' ایک دو نمازی ہوتے تھے۔ جب میں نے محسوس کیا یہ تو ویران ہو جائے گی تو میں نے ایک چھوٹا سا کمرہ بنوایا اور وہیں اپنی فیملی سمیت شفٹ ہو گیا' خالص اللہ کی رضا کے لیے۔ ادھر ہر طرف گرد و غبار اڑتا تھا' آس پاس کوئی بلڈنگ نہیں تھی' لیکن خیر میں جم کر رہا۔ اس کے بعد کچھ تعمیراتی کام شروع ہوا۔ بہت سستا زمانہ تھا' ۱۴ روپے مزدوری تھی اور ۲۵ روپے مستری لیتا تھا' ۳۶ روپے کے سو بلاک آتے تھے۔ بڑا کسمپرسی کا عالم تھا' پانچ پانچ روپے چندہ کر کے یہ کام ہوا ہے' ایک پلر کھڑا کر دیا' پھر چھت ڈالنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اب سمجھ لیجیے کہ تقریباً پچاس کروڑ روپے کی یہ بلڈنگ بنی ہوئی ہے' لیکن یہ ویسے نہیں ہوا' بڑی غربت کے ساتھ آہستہ آہستہ ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچا ہے۔ پھر لوگوں نے کہا کہ آپ کینیڈا آجائیں' یہاں بھی آ کر کام کریں۔ وہاں بھی یہی ہوا۔ آٹھ آدمیوں سے ہم نے کام شروع کیا' اب ہمارے پاس الحمد للہ پچاس ہزار مربع فٹ کی عمارت ہے اور دو یونٹ ہیں۔ ایک یونٹ سولہ ہزار مربع فٹ' دوسرا بیس ہزار مربع فٹ' جبکہ پندرہ ہزار مربع فٹ پر پارکنگ ہے جو بہت بڑی پارکنگ کہلاتی ہے۔ الحمد للہ علی ذلک !

س: آپ کینیڈا کب تشریف لے گئے تھے؟

ج: ۱۹۹۰ء میں کینیڈا جانا ہوا۔

س: پاکستان کو خیر باد کہہ کر آپ نے مستقلاً کینیڈا میں سکونت اختیار کر رکھی ہے' اس کے محرکات پر کچھ فرمایئے۔

ج: (ہنستے ہوئے) خیر ترکِ وطن تو اب بھی نہیں کیا۔ میں وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا' لیکن وہاں کے ساتھیوں کا اصرار تھا۔ مجھے دار العلوم کی بھی فکر تھی کہ اس کو بھی سنبھالنا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو رہ جاتے ہیں' یہاں بھی کام کریں گے' پاکستان میں بھی کام کریں گے اور آتے جاتے رہیں گے۔ اُس وقت ویزا وغیرہ اتنا مسئلہ بھی نہیں تھا' کام آسان تھا۔ بس پھر یہ کام وہاں بھی شروع کر دیا۔ اب جامعہ اسلامیہ کینیڈا اچھا ادارہ بن گیا ہے۔ اس کا ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز ہے' میں اس کا بانی بھی ہوں' چیئرمین بھی ہوں۔ الحمد للہ اس میں قرآن کریم کی تعلیم بھی ہے' احادیث کی تعلیم بھی ہے' ساتھ ساتھ سنڈے اسکول بھی ہے۔ بچوں کے لیے قرآن کریم کی تعلیم اور تذکیر کی تین کلاسیں ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی ایکٹیویٹی ہے۔ مثال کے طور پر وہاں لوگ دینی پروگرام سے واقف نہیں تھے' وہاں پہلی مرتبہ میں نے محفلِ نعت کا پروگرام رکھا اور یہ کوشش کی کہ اس میں شرکیہ الفاظ نہ ہوں۔ لوگوں نے ساتھ دیا اور نو مرتبہ محفلِ نعت منعقد ہوئی۔ پھر پورے نارتھ امریکہ میں دینی محفلیں منعقد کیں' انٹرنیشنل

محفل حسن قراءت کا بھی اہتمام کیا اور بڑے بڑے قراء حضرات کو وہاں مدعو کیا۔

س: ہماری معلومات کے مطابق پہلی مرتبہ پاکستان میں انٹرنیشنل محفل حسن قراءت کا اہتمام کرنے کا اعزاز آپ کو حاصل ہے۔ اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالیں۔

ج: اصل میں ہم چھوٹی چھوٹی محفلوں کا انعقاد تو کرتے تھے' کیونکہ میرے چھوٹے بھائی قاری وحید ظفر قاسمی' شاکر قاسمی' یہ سب ماشاء اللہ کراچی کے بہترین قاری ہیں۔ ایک دفعہ ہم نے فردوس کالونی کی لال مسجد میں محفل قراءت منعقد کی تو خیر کچھ نمازی بیٹھ گئے۔ ایک قاری نے تلاوت کی' دوسرے نے کی' تیسرے نے کی' چوتھے نے کی' تو ایک آدمی کھڑا ہو گیا' مجھے ابھی تک یاد ہے اس کا جملہ یہ تھا کہ ''بھائی قرأتاں ہی قرأتاں ہوتی رہیں گی؟'' وہ سمجھ رہے تھے کہ تلاوت کے بعد نعت ہوگی' پھر تقریر ہو گی۔ میں نے کہا کہ جی ہاں قرأتاں ہی قرأتاں ہوں گی۔ خیر وہ اٹھ کر چلے گئے۔ آخر میں تین چار لوگ ہی رہ گئے۔ یعنی محفل حسن قراءت کا یہاں تعارف ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ ہم نے اتنی مشکل سے یہ محفل منعقد کی اور لوگ اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن میں ہمت نہیں ہارا۔ ہوا یہ تھا اصل میں کہ چھوٹے بھائی قاری وحید ظفر قاسمی کا ایک جگہ پروگرام تھا' انہوں نے مجھے کہا کہ آپ آجائیں' وہاں وزیر خزانہ شعیب صاحب آرہے ہیں۔ یہ ایوب خان کا دور تھا۔ میں نے کہا کہ چلیں چل کر دیکھتے ہیں۔ وہاں گئے اور وزیر صاحب بھی تشریف لائے۔ قاری صاحب نے تلاوت کی اور ان کی تلاوت کو شعیب صاحب نے بہت پسند کیا اور اپنی تقریر میں اس کی خوب تعریف کی۔

اب ہمیں اچانک شرارت سوجھی' میں نے چھوٹے بھائی کو کہا کہ اگر ہم ایک بڑی محفل کر لیں اور اس میں شعیب صاحب کو بھی بلا لیں تو بہت اچھا ہوگا۔ قاری صاحب نے کہا کہ ہاں انٹرنیشنل محفل قراءت ہوگی۔ اب شعیب صاحب نے سیکریٹری کو بلایا اور کہا کہ ''دیکھو قاری صاحب کیا کہہ رہے ہیں' ان کو ٹائم دینا ضروری ہے''۔ گھر آکر مشورہ ہوا کہ پھر تو ہمیں اعلان کرنا چاہیے۔ اب ہم میر خلیل الرحمٰن صاحب جنگ اخبار والوں کے پاس گئے' برنس روڈ میں ان کا چھوٹا سا دفتر تھا' بڑے پرجوش انداز میں ملے اور پوچھا ہاں بھائی کیا کام ہے؟ ہم نے کہا کہ ہم ایک انٹرنیشنل محفل قراءت کرنا چاہ رہے ہیں اور اس میں وزیر خزانہ شعیب صاحب آرہے ہیں۔ انہوں نے کہا شعیب صاحب آرہے ہیں' وعدہ کر لیا ہے؟ میں نے کہا جی بالکل وعدہ کر لیا ہے۔ اچھا ان کے کچھ کام اٹکے ہوئے تھے۔ میر خلیل الرحمٰن صاحب بہت اچھے آدمی تھے' اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے' ہمیں بہت سپورٹ کیا، انہوں نے پانچ چھ لائنوں میں ایک خبر بنائی اور جنگ اخبار کے فرنٹ پیج پر چھاپ دی۔ اس اخبار کی بڑی اہمیت تھی اور اب بھی ہے۔ اُس وقت تو چند اخبار ہوتے تھے اور یہ اخبار تو ایک طوفان تھا۔ اب ایسا ہوا کہ جب خبر چھپ گئی تو پورے ملک میں بات مشہور ہوگئی کہ انٹرنیشنل محفل قراءت ہونے والی ہے۔

میرے بڑے بھائی ظاہر قاسمی صاحب اخبار ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا کہ یہ کیا چھپا دیا تم نے؟ جب میں نے اخبار دیکھا تو بڑی خوشی ہوئی کہ اتنے بڑے اخبار میں ہمارا نام بھی آ گیا۔ پھر پوچھا کہ کس کس کو بلاؤ گے؟ میں نے کہا کہ چند قاریوں کو بلالیں گے۔

پھر دونوں بھائیوں نے مشورہ کیا کہ چلو مصری سفارت خانہ چلتے ہیں۔ ہم گئے اور بات کی۔ ہم نے کہا کہ ہم قاری عبد الباسط صاحب کو بلانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو تین دن میں بتائیں گے۔ تین دن بعد انہوں نے ہمیں بلالیا' ہم چلے گئے تو بتایا کہ آنے کو تیار ہیں لیکن کچھ ہدیہ لیں گے۔ اُس زمانے میں پانچ ہزار روپے انہوں نے مانگے۔ وہ بہت بڑی رقم تھی۔ اس کے بعد ہم چندے کے لیے نکلے۔ باوانی گروپ کے پاس گئے اور کہا کہ ہم ایک محفل قراءت کرنا چاہ رہے ہیں' کچھ تعاون فرمائیں۔ باوانی صاحب نے اپنے سیکریٹری سے کہا کہ قاری صاحب کو پانچ ہزار روپے دے دیں۔ پانچ ہزار روپے کی اُس وقت بڑی قدر و قیمت تھی' ہم خوش ہو گئے۔ اس کے بعد ہم دوسری جگہ گئے اور کہا کہ ہم باوانی صاحب کے پاس گئے تو انہوں نے پانچ ہزار روپے دیئے' آپ بھی کچھ تعاون فرمائیں۔ انہوں نے کہا کوئی بات نہیں' پانچ ہزار روپے مجھ سے بھی لے لیں۔ جب ہم شام کو گھر لوٹے تو ۲۷۰۰۰ روپے ہو گئے تھے۔ پھر خیر ہم نے نشتر پارک بک کیا اور پہلی مرتبہ انٹرنیشنل محفل حسن قراءت کا پروگرام کیا۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد یہ پروگرام ہوا تھا۔ جب ایوب خان نے معاہدہ تاشقند کیا تو اس کے خلاف ملک میں بہت ہنگامہ مچا تھا۔ اس محفل حسن قراءت کی وجہ سے یہ ہنگامہ تھم گیا اور لوگوں کی توجہ اس پروگرام کی طرف ہو گئی۔ اُس وقت گورنر سندھ نواب کالا باغ تھے۔ شعیب خان نے جا کر ایوب خان کے سامنے اس محفل کی خوب تعریف کی' اس لیے کہ یہ بہت بڑی محفل تھی۔

اب اگلے سال ہم نے ایوب خان کو دعوت دی' فوراً جواب آ گیا کہ میں آؤں گا۔ ہم نے بیوقوفی یہ کی کہ یہ خبر اخبارات کو دے دی کہ فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان آئیں گے۔ اس پر ایک مسلک والوں نے خطوط کی بھرمار کر دی کہ یہ تو دیوبندی ہیں' فلانے ہیں۔ اس پر ایوب خان نے مجھے اسلام آباد طلب کر لیا۔ میں گیا اور کہا کہ قرآن کی محفل ہوگی' کچھ اور تو نہیں ہوتا ہے۔ اس پر انہوں نے مجھے وہ خطوط کے ڈھیر دکھائے اور کہا کہ میں معذرت چاہتا ہوں' نواب کالا باغ اور شعیب خان آئیں گے۔ نواب کالا باغ کا بڑا رعب تھا' میں نے ان کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا' بڑا بارعب آدمی تھا' ہنستا بالکل نہیں تھا۔ یہ ہماری دوسری محفل قراءت تھی۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ اس کے اکثر اخراجات گورنمنٹ نے کیے تھے۔ پھر یہ سلسلہ بڑا مقبول ہوا' اس کے نتیجے میں ہزاروں قاری پیدا ہو گئے اور پوری دنیا میں انٹرنیشنل محفل حسن قراءت کا آغاز ہو گیا۔

ن: جی اب تو ماشاءاللہ کئی مدارس نے یہ سلسلہ شروع کر رکھا ہے' لیکن اولیت کا اعزاز آپ کو

حاصل ہے۔ الفضل لِلمُتقدّم!

ج: جی ہاں (ہنستے ہوئے) ہمیں بہت ساری چیزوں کا اعزاز حاصل ہے۔ اسی طرح ڈیجیٹل کیمرے کا مسئلہ ہے۔ ٹی وی پر میرا ایک پروگرام آ رہا تھا' اس پر ایک عالم میرے پاس آئے اور کہنے لگے یہ جائز نہیں ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آج سے چالیس سال پہلے جب ہم نے کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ کا آغاز کیا تھا تو بنوری ٹاؤن سے میرے خلاف فتویٰ آیا کہ یہ حرام ہے۔ وہ فتویٰ میں نے محفوظ کر رکھا ہے اور آج اگر میں وہ فتویٰ دکھاؤں تو لوگ ہنسیں گے۔ اس لیے کہ اب تو وہاں پر بھی کمپیوٹر استعمال ہو رہا ہے۔ آج آپ دیکھیں کیا رونق ہے' ۳۲۰۰۰ سے زائد بچوں' بچیوں نے یہاں سے تعلیم حاصل کی ہے۔

س: مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و جبر اور مسلم ممالک میں غلبۂ اسلام کے پُرامن طریقوں سے مایوس ہو جانے کے بعد چند لوگوں نے مسلح جدوجہد ہی کو غلبۂ اسلام کا واحد راستہ قرار دے رکھا ہے' اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

ج: ملکی حالات کے بارے میں میرا موقف وہی ہے جو تنظیم اسلامی کے تحت ہونے والی کانفرنس ''شریعت' کیوں' کیا' کیسے'' میں میں نے پیش کیا کہ کبھی بھی تشدد اور نفرت سے محبت کے پھول نہیں کھل سکتے' تشدد سے تشدد جنم لیتا ہے اور نفرت سے نفرت جنم لیتی ہے۔ کبھی یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ تشدد کریں اور آپ پر محبت کے پھول نچھاور کیے جائیں۔ آج دنیا کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے یہ تشدد کی وجہ سے ہو رہا ہے' چاہے سیاسی تشدد ہو' چاہے مذہبی تشدد ہو۔ دین تو محبت سے پھیلا ہے۔ صدیوں سے ہمارے بزرگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا اور یہ حقیقت بھی ہے۔ اس لیے کہ امن اور محبت سے ہی دین پھیلا ہے۔ آپ دیکھئے کہ پوری دنیا میں میڈیا پروپیگنڈا یہ کیا گیا ہے کہ اسلام تلوار اور کلاشنکوف سے پھیلا ہے۔ اس طرح ہمارے بزرگوں کی صدیوں کی محنت پر پانی پھر گیا ہے۔ خیر جو لوگ اس طرح کر رہے ہیں میں ان کو برا نہیں کہتا' وہ جو سمجھ رہے ہیں ان کی مرضی۔ اگر وہ پیار و محبت کے ساتھ چلتے' اسلامی تعلیمات کو پھیلانے اور لوگوں کے فکر و نظر کے درست کرنے کے ذریعے سے' تو یقیناً بڑی اچھی بات ہوتی۔ ان خودکش حملوں سے کیا اسلام نافذ ہوگا؟ ان کا کچھ حاصل نہیں' سوائے اس کے کہ ہم بدنام ہو رہے ہیں۔ اور خودکش حملے کس پر ہو رہے ہیں؟ ایک ہوٹل میں گزشتہ دنوں ایسا حملہ ہوا اور بہت سے لوگ مارے گئے۔ وہاں غیر ملکی بھی تھے' مہمان بھی تھے' اپنے لوگ بھی تھے۔ کیا یہ اچھی بات ہے؟ کتنے بیچارے غریب مزدور محنت کرنے والے مارے جاتے ہیں۔ انہوں نے کیا قصور کیا ہے؟ ایک آدمی کے پیچھے کتنی محبتیں ہوتی ہیں' کتنے تعلقات ہوتے ہیں' اور آپ نے اٹھایا اور ختم کر دیا۔ اگر کوئی حربی کافر کسی مسلمان ملک پر حملہ کرتا ہے تو وہاں کے مسلمانوں پر فرض ہے

کہ اس کا مقابلہ کریں' لیکن مسلمان مسلمان کو مارے تو یہ قتل ناحق ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ پاکستان کے اندر کونسی جنگ ہو رہی ہے' کون کس کو مار رہا ہے۔ آپ دیکھیں کہ مارنے والا بھی مسلمان' مرنے والا بھی مسلمان۔ تو مسلمان کا خون اتنا ارزاں کیوں ہو گیا ہے؟ اس لیے میرا تو کہنا یہ ہے کہ یہ طریق کار غلط ہے۔ یہ لوگ کوئی تعمیری کام نہیں کر رہے ہیں اور اس کا نتیجہ سوائے افراتفری کے کچھ بھی نہیں۔ اس طریقے سے نہ اسلام پھیلے گا اور نہ کوئی تعمیری کام ہو سکے گا۔ اگر منظم جدوجہد کی جائے' اسلام کو اس ملک میں نافذ کرنے کے لیے' جیسے آپ کی تنظیم اسلامی کام کر رہی ہے اور دوسری تنظیمیں بھی کام کر رہی ہیں کہ اسلام لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے' تو یہ ہے کرنے کا اصل اور پائیدار کام!

س: آپ کے علم میں ہو گا کہ عالم عرب کے کچھ شیوخ کی تعلیمات کے نتیجے میں ایک تکفیری فکر ''التکفیر والھجرۃ'' کے نام سے بڑی عام ہو رہی ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: دیکھیں' اگر کوئی کسی کے کفریہ عمل کو دیکھ کر اسے کافر قرار دے' ظاہر بات ہے کہ وہ تو ضروری ہے۔ اس کو اس طرح تقسیم کریں کہ ایک یقین رکھتا ہے دین اسلام پر' دوسرا نہیں رکھتا۔ جو نہیں رکھتا اس کو کافر کہہ دینا کوئی بری بات نہیں ہے' اس لیے کہ کافر کو کافر تو کہہ دینا چاہیے' اور جو مؤمن ہے اس کو مؤمن کہنا چاہیے۔ لیکن اس طریقے سے چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنا کر' انفرادی طور پر کسی کو کافر قرار دے کر فتویٰ دے کر اس کو واجب القتل قرار دینا' یہ کسی کو اختیار نہیں ہے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ نفرت سے نفرت جنم لیتی ہے۔ آپ دیکھیں' سپاہ صحابہ والے نعرہ لگاتے ہیں ''کافر کافر شیعہ کافر''۔ یہ نعرہ لگانے کی وجہ سے کتنے شیعہ مسلمان ہوئے؟ مجھے بتائیں! تو یہ جو انداز ہے کہ کافر کافر فلاں کافر' اس کو قتل کر دو' میں تو اس کو بہت ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ٹھیک ہے وہ کافر ہے تو ہے' اس کو کہنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں تو یہ کہا کرتا ہوں کہ سیدھی سیدھی بات ہے کہ ہمارے لیے کائنات میں خوبصورت اور ماڈل نمونہ زندگی اگر کوئی ہے تو سرکار دو عالم حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

''تحقیق تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے''۔

کیا شان ہے! آپ ﷺ پورے عرب میں بلاشرکت غیرے حکمران اعلیٰ ہیں اور ایک اشارۂ ابرو پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جان دینے والے ہیں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ آپ کو تو پتا ہے کہ آپ ﷺ نے کریم ابن کریم بن کر دکھایا اور فرمایا:

((اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ ' لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ))

''جاؤ تم سب آزاد ہو' آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں''۔

ہمیں بھی اپنے اندر یہ ظرف پیدا کرنا ہے۔ مکہ مکرمہ میں دیکھ لیں' کوئی آپ کو مارتا بھی ہے تو آپ نے

ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کوئی پتھر مارتا ہے تو کھا لیا۔ زخم کھا لیں کسی کو زخم نہ دیں' ذہنی اذیت بھی نہ دیں۔ دین تو ہمارا محبت کا دین ہے اور محبت کے انداز سے ہی یہ دلوں میں اترتا ہے۔ میرا تو یہ پیغام ہے سب کو کہ نفرتوں کو دلوں سے کھرچ کر نکال دو۔ اگر حکمران غلط ہیں تو ((اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ)) والی بات ہے کہ تمہارا عمل ہی تمہارا حکمران ہے۔ اگر ان کا عمل کافرانہ ہے تو ہمارا عمل کیا مومنانہ ہے؟ اس لیے نفرت کرنے کی بجائے دل میں محبت پیدا کریں' ان کو تبلیغ کریں۔ دیکھیں ایک بڑی دلچسپ بات ہے' شکاگو میں عالیجاہ محمد کے نام سے ایک شخص تھا' جس نے ایک درجہ میں نبوت کا اعلان کر دیا۔ وہ بہت ہی بے دین آدمی تھا اور نسلی اعتبار سے کالا تھا۔ اس کی تحریک کالوں میں چلی' اتنی مضبوط تحریک چلی کہ سارے کالے اس کے مرید ہو گئے۔ میں نے ون ملین شو اس کا دیکھا تھا۔ لیکن ہمارے حضرات مایوس نہیں ہوئے' اس کے پاس بھی گئے' اس کو بھی جا کر اللہ کا دین پہنچایا کہ یہ اللہ کا دین ہے' سچائی ہے۔ وہ تو ایمان نہیں لایا۔ گویا ابوجہل کا ابوجہل ہی رہا' عکرمہ نہ بن سکا' لیکن آپ یہ دیکھیں اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے وارث شاہ نے اسلام قبول کر لیا اور کہا میرا باپ غلط تھا' میں ختم نبوت پر ایمان لاتا ہوں۔ اس کے بعد سب نے کہا کہ اس کو اس تحریک سے نکال دو۔ اس لیے کہ وہاں تو سب شیطان جمع تھے۔ تو میں یہ کہتا ہوں کہ مایوس نہیں ہونا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے جس وقت ملک الجبال نے کہا تھا کہ آپ اجازت دیں تو میں طائف کی بستی کو ان دو پہاڑوں کے درمیان پیس دیتا ہوں' تو آپؐ نے یہ فرمایا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ ایمان نہ لائیں لیکن ان کی اولادیں ایمان لے آئیں۔ اگر نظر ہماری دور تک ہو تو پھر تشدد نہیں آئے گا' پھر محبت کے پیغام دینا ہے۔ دین تو بھائی محبت کے ساتھ پھیلتا ہے' میرا تو اس پر یقین کامل ہے' نہ یہ ریلیوں سے پھیلتا ہے نہ ہنگاموں سے پھیلتا ہے' نہ شور شرابے سے اور نہ کسی کو کافر کہنے سے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے دل میں ایمان کی آگ نہیں لگی ہوئی' ہم کیسے آگ لگائیں گے؟ اب ذرا سی مثال ہے کچھ لوگوں نے خاص کر تبلیغی جماعت والوں نے محنت کی اور آپ کے کرکٹرز داڑھی والے ہو گئے اور نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ یوسف یوحنا کو دیکھیں محمد یوسف بن گیا۔ آپ دیکھیں کیسی تبدیلی آئی ہے!

س: آپ کی تفسیر بنام ''بصیرتِ قرآن'' اپنے سہل اسلوب کی بنا پر بحمد اللہ روز افزوں مقبولیت کی حامل ہے۔ آپ نے تفسیر قرآن پر کب کام کا آغاز فرمایا اور اس کے محرکات کیا تھے؟

ج: اس تفسیر کے لکھنے کی وجہ یہ بنی کہ میرے والد مرحوم' اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے' ان کا یہ شوق تھا کہ تفسیر قرآن لکھوں۔ ہمارے خاندان میں بڑے بڑے عالم اور بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں' جیسا کہ مولانا قاسم نانوتویؒ' لیکن مفسر کوئی نہیں گزرا۔ والد صاحب کی خواہش یہ تھی کہ تفسیر قرآن لکھیں۔ چنانچہ انہوں نے شروع کر دی۔ مجھے یاد ہے' میں چھوٹا تھا' دس پارے انہوں نے مکمل کر لیے

تھے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اب تقسیم ہند کا واقعہ ہوا' ہم لوگ یہاں آ گئے۔ اس کے بعد وہ تفسیر پتا نہیں کہاں گئی' کہیں گم ہو گئی۔ یہ دکھ ایسا تھا کہ میرے دل کے اندر ایک جوش پیدا ہوا کہ میرے والد صاحب کی کتنی بڑی تمنا تھی جو پوری نہیں ہوئی۔ میں نے پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے توفیق دے' میں بالکل بے عمل اور بے علم آدمی ہوں' لیکن اگر آپ چاہیں مجھ سے کام لے لیں کہ میں والد صاحب کی تمنا پوری کروں۔ چنانچہ یہی تمنا محرک بنی اور پھر میں نے پڑھنا شروع کیا' تمام تفسیریں جمع کرنی شروع کیں' تمام لغات کو دیکھا اور جو بھی مضامین اساتذہ سے سیکھے تھے معانی' بلاغت' فصاحت یہ دیکھے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ مجھے لکھنا چاہیے۔ ستائیس سال پہلے اس کو لکھنا شروع کیا اور ستائیس سال مسلسل دن رات لکھا اور الحمد للہ چھ جلدوں میں یہ تفسیر مکمل ہو گئی۔ اس میں بڑے مرحلے بھی آئے۔ اب الحمد للہ دو دفعہ چھپ کر ختم ہو گئی ہے اور تیسرا ایڈیشن تیار ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ اس تفسیر کو حضور اکرم ﷺ کے روضۂ اقدس میں مکمل کروں' جیسے امام بخاریؒ نے کیا۔ چنانچہ میں نے سورۃ الفیل سے سورۃ الاخلاص تک مکہ مکرمہ میں اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس حضور اقدس ﷺ کے قدموں میں جا کر مکمل کی۔

س: تفسیر میں آپ نے جو خاص منہج اختیار کیا ہے اس کے کیا مقاصد ہیں؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے اپنے پیش نظر یہ بات رکھی ہے کہ میں نے یہ تفسیر علماء اور بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کے لیے نہیں لکھی' بلکہ عام بالکل نابلد لوگوں کے لیے یہ تفسیر ہے' جن کو کچھ پتہ نہیں ہے کیا ہو رہا ہے۔ ﴿لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾ تو میری نظر تو بالکل کم پڑھے لکھے لوگوں پر ہے' تاکہ اس تفسیر کو ہر کوئی سمجھ سکے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے میری رفیقہ حیات کو انہوں نے اس میں میری بڑی مدد کی۔ کوئی حصہ پورا لکھ لیتا تو میں ان کو دیتا کہ اس کو پڑھو اور یہ پنسل لے لو' جہاں بھی کوئی بات سمجھ نہ آئے اس کو انڈر لائن کر دو۔ میں نے کہا کہ اس بہانے پڑھ بھی لیں گی' تو ماشاء اللہ وہ انڈر لائن کرتی جاتی تھی اور میں وہاں آسان سے آسان تر لفظ لانے کی کوشش کرتا تھا۔ چونکہ عام لوگوں کے ذہن کو مد نظر رکھا لہٰذا بہت ہی آسان انداز اختیار کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں علمی خزانے اور موتی نہیں بکھیرے گئے' کیونکہ اگر یہ بھی درکار ہے تو الحمد للہ ہمارے بزرگوں نے بڑی محنت کی ہے' علمی تفاسیر موجود ہیں جن کے ہم خوشہ چین ہیں' لیکن میرے پیش نظر یہ تھا کہ اس کا مطالعہ کرنے والے کو جب علم کا شوق پیدا ہو جائے تو علمی تفاسیر کی طرف رجوع کرے۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ تفسیروں میں قصے کہانیاں بہت زیادہ ہیں' بعض مفسرین نے دجال پر دس دس صفحے لکھ ڈالے ہیں۔ ٹھیک ہے ہمارا یقین ہے کہ وہ آئے گا' لیکن اتنا وقت صرف کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ پڑھنے والے کنفیوز ہو جائیں۔ میں نے کوشش یہ کی ہے کہ قرآن کریم کی

وضاحت بس احادیث کی روشنی میں ہو جائے۔ایک بہت بڑا فتنہ میں نے باہر یہ دیکھا' پتہ نہیں یہ ہمارے بزرگوں کے نظر میں ہے یا نہیں' کہ ہم چاروں فقہ بیان کر دیتے ہیں کہ امام اعظمؒ کا یہ قول ہے' امام شافعی کا یہ قول ہے' امام مالک کا یہ قول ہے' امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول ہے' اب آپ کا چوائس ہے کہ بھائی یہ بات امام ابوحنیفہ نے بڑی اچھی کہی اس کو لے لو اور اس نے اچھی کہی اس کو لے لو۔ میں نے کہا کہ بھائی چار امام تو وہ تھے' پانچواں تو تم خود ہو۔ آپ کو کس نے یہ اختیار دیا؟ یہ فتنہ ہے۔ اس لیے میں واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ میں حنفی اہل سنت والجماعت ہوں الحمد للہ! جو بھی میں فقہی مسئلہ بیان کروں گا' فقہ حنفی کے مطابق بیان کروں گا' کہیں کہیں میں نے امام شافعیؒ کو بھی بیان کیا ہے' وہ بھی ہمارے امام ہیں' لیکن ان کو میں نے زیادہ نقل نہیں کیا' تا کہ جو نئے نئے امام بن رہے ہیں ان کا دروازہ بند ہو جائے۔ اس کے علاوہ میں نے اس میں لغات القرآن کا خاص خیال رکھا۔ ایک اور خوبصورتی اس میں یہ ہے کہ پوری تفسیر میں کہیں بھی لفظ خدا نہیں ہے۔ میرے نزدیک لفظ خدا کہنا کوئی بری بات نہیں ہے' ہمارے بزرگوں کی تفسیروں میں لفظ خدا موجود ہے' لیکن میرا اپنا ذہن یہ ہے کہ لفظ خدا کہنے میں کوئی اجر و ثواب نہیں ہے' اللہ چونکہ قرآن کا لفظ ہے' لہٰذا اس کے کہنے میں اجر و ثواب ہے۔ دوسرے یہ کہ خدا کی جمع آتی ہے ''خداؤں'' اور اس کے پیچھے جمع کا تصور بھی ہے' جیسے اہرمن اور یزداں' god کی جمع gods ہے اور اس کے پیچھے تین خدا کا تصور ہے' تثلیث کا عقیدہ ہے' اور اس کی مؤنث بھی ہے godess۔ لیکن اس کے برخلاف لفظ اللہ وہ لفظ ہے جس کا نہ تثنیہ ہے نہ جمع ہے اور نہ مؤنث ہے۔ لفظ اللہ خود واحد ہے اور توحید کی علامت ہے۔

س : شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے اسارتِ مالٹا سے واپسی پر اُمت کی اصلاحِ احوال کے لیے جو تدبیر تجویز فرمائی تھی' اُس میں ایک گلی گلی عوامی دروسِ قرآن برائے بالغان کا انعقاد بھی تھا' آپ اس کی عملی صورت کیا تجویز کرتے ہیں؟

ج : جی انہوں نے فرمایا تھا کہ میں نے بڑا غور و فکر کیا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ اس حوالے سے آج کل یورپ میں مسلم فیملیز کا ایک طریقہ ہے کہ ایک چھوٹی سی تفسیر لے لی اور کسی گھر میں پانچ' چھ فیملیز جمع ہو گئیں۔ وہاں انہوں نے قرآن شریف کا ایک صفحہ' دو صفحے جتنی بھی گنجائش ہے وہ پڑھا اور کھانا وغیرہ ساتھ کھایا اور پھر چلے گئے۔ یہ عام روایت بن گئی ہے اور اس طریقے سے بھی کافی فائدہ ہو رہا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نارتھ امریکہ کے اندر بھی اسی طرح چھوٹے چھوٹے گھروں میں بھی ماشاء اللہ دروس کی محافل ہو رہی ہیں۔ میں نے ''بصیرتِ قرآن'' اسی حوالے سے لکھی ہے کہ عوام الناس اس سے استفادہ کریں۔ اب میں آپ کو ایک تاریخی بات بتا دوں کہ مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ نے ایک کام کیا تھا۔ آپ کے علم میں ہے کہ اکبر نے دین الٰہی کے نام پر دین بنایا تھا' دین الٰہی کیا تھا

کہ دینِ شیطان تھا۔ اس میں اکبر نے حضور ﷺ کے نام کو بالکل نکال دیا تھا۔ کہتا تھا ''لا الٰہ الا اللہ'' کلمہ ہے ''محمد رسول اللہ'' کچھ بھی نہیں ہے اور اذان میں رسول اللہ ﷺ کی جگہ اپنا نام لگانے کے لیے دباؤ ڈالتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک چیز ایجاد ہوئی جس کا نام تھا ''میلادِ اکبری''۔ اس کا نام اکبر کے دور میں اس لیے رکھا گیا تھا تاکہ اکبر کا نام آ جائے اور چل جائے۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت محدث دہلویؒ نے سوچا کہ یہ تو بہت سخت بات ہو رہی ہے کہ حضور ﷺ کا نام مٹا دیا گیا' تو انہوں نے تمام مریدین سے کہا کہ اپنے گھروں میں ''میلاد النبی ﷺ'' کی محفلیں قائم کرو اور ان میں حضور اکرم ﷺ کا ذکر ہوتا تھا۔ چنانچہ وہاں سے یہ میلاد چلا اور وہ میلاد النبی آج کل والا نہیں تھا بلکہ سیرت پاک بیان ہوتی تھی۔ اس کے بعد ہوتے ہوتے کچھ لوگوں نے اس میں نعتیں وغیرہ پڑھنا شروع کر دیں۔ اب تو خیر پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اب اس میں سلام بھی شامل کر دیا کہ کھڑے ہو کر سلام پڑھ رہے ہیں۔ تو یہ بات اصل میں وہاں سے شروع ہوئی کہ حضور ﷺ کی سیرت پاک پڑھی جائے اور یہ ہوتے ہوتے کہاں سے کہاں نکل گئی۔ اسی طریقے سے تفسیر قرآن کے حوالے سے کچھ خامیاں میں ابھی سے محسوس کر رہا ہوں' ہو سکتا ہے پچاس سال بعد اور بھی فساد پیدا ہو۔ اب ہو یہ رہا ہے کہ ایک صاحب نے ایک آیت پڑھی' اب بیٹھ کر کوئی کچھ کہہ رہا ہے' کوئی کچھ کہہ رہا ہے اور اس میں سب خوش ہو رہے ہیں کہ بھائی میں تو بڑا پڑھا لکھا ہوں اور خطابت کے جوہر دکھلائے جا رہے ہیں۔ اس سے بڑا نقصان ہو گا۔ اس لیے کہ تفسیر قرآن کا علم بھی تو ہونا ضروری ہے۔ آپ یہ کوشش کریں کہ گھر گھر کے اندر درس ہوں' پانچ پانچ چھ چھ سات سات لوگ شامل ہوں' لیکن اس میں نگرانی ہونی چاہیے' کوئی جاننے والا ہو اس کو دیکھے۔ اپنے طور سے بیان نہ کریں' کسی مستند تفسیر سے بیان کریں۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر نگرانی ہو گی تو بہتر ہو گا' اس لیے کہ نئی نئی بحثوں کا دروازہ کھلنے سے ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ اور یہ دروسِ قرآن کی محافل ضرور ہوں' گھر گھر ہوں۔ دو چار فیملیز مل کر باری باری اپنے اپنے گھر پر کروائیں' بعض اوقات کھانوں کا بھی اہتمام ہو' لیکن نگرانی ضروری ہے' اور کہا جائے کہ بھائی جو بھی بیان کرو اسی تفسیر سے بیان کرو' اسی کو سمجھو' خود رائی نہ کرو' اپنی عقلی و منطقی دلیل پیش نہ کرو۔

س: میڈیا آج دین کی دعوت و تبلیغ اور قرآن کی دعوت پہنچانے کا بہت مؤثر ذریعہ بن گیا ہے اور اب تک اس کے استعمال میں دو آراء ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: یہ اختلاف بہت جلد ختم ہو جائے گا' اس پر کوشش ہو رہی ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ تصویر کے حکم میں نہیں ہے' یہ ڈیجیٹل امیج ہے' تصویر نہیں ہے جس کو حرام قرار دیا جائے۔ ویسے اس اختلاف سے ہمیں بڑا نقصان پہنچا۔ میں پھر دہرا رہا ہوں کہ جب میں نے مدرسہ میں کمپیوٹر کا استعمال شروع کیا تھا تو لوگوں نے کفر کے فتوے دیے تھے' باقاعدہ ثبوت اب تک میرے پاس رکھے ہوئے ہیں' اور ٹی وی کے

بارے میں کہتے تھے کہ بھائی وہاں تو ٹی وی استعمال ہوتا ہے اس لیے ہم تو نہیں جاتے۔ میں نے اُس وقت کہا تھا کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ بھی حلال ہو جائے گا۔ اور میں نے کہا کہ یہ تردید کریں گے' اور یہ ہو گیا۔ عنقریب سارے علماء متفق ہو جائیں گے کہ اس میڈیا کو استعمال کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ بہت ہی مؤثر ذریعہ ہے۔ پہلے دور میں کتابیں مؤثر ہوا کرتی تھیں اور اب بھی ہیں۔ پہلے دور میں تقریریں بہت مؤثر ہوا کرتی تھی اور اب بھی ہیں۔ لیکن میڈیا ایک ڈائریکٹ ذریعہ ہے جو گھر گھر کے اندر ہر وقت کروڑوں اربوں لوگ دیکھتے ہیں اور ہم نے اسے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ٹھیک ہے اگر اس میں غلط کام ہو رہا ہے وہ تو ناجائز ہے' لیکن اگر اس کو قرآن کریم کے پھیلانے کے لیے' دین کی دعوت کے لیے اور دین کی تبلیغ کے لیے استعمال کریں تو جائز ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہر دور میں مقابلہ اپنے دور کے حساب سے ہوتا ہے' ایٹم بم کا مقابلہ ایٹم بم سے ہوگا۔ اگر آج پاکستان کے پاس ایٹمی طاقت نہ ہوتی تو کب کا وجود ختم ہو چکا ہوتا۔ قرآن کریم کہتا ہے: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾

س: مسلم عوام مغربی تہذیب کے دلدادہ اور مسلم حکمران مغرب کے پروردہ ہیں۔ ان حالات میں اسلام کا نظام عدل اجتماعی یعنی Politico-Socio-Economic System کے قیام کی جدوجہد' جو اَز روئے قرآن حکیم مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے' کس طریقۂ کار پر عمل پیرا ہو کر ممکن ہے؟

ج: اس کے لیے میں کہوں گا کہ آپ کوئی بھی نظامِ زندگی نااہلوں کے حوالے کر دیں تو تباہی ہی مقدر ہو گی۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی میں اس معنی میں بڑی عزت کرتا ہوں کہ اس جیسی ذہین شخصیت دنیا میں بہت دیر سے پیدا ہوتی ہے' بہت ذہین آدمی تھے' لیکن ان کو تکبر' شراب اور عورت کھا گئی' ورنہ اس سے کامیاب سیاست دان کون ہوگا۔ اس نے کیا کیا کہ پوری انڈسٹری کو' بنکوں کو' قوم کو بیوروکریسی کے حوالے کر دیا۔ ہر شے قومی ملکیت قرار دے دی۔ اب معلوم یہ ہوا کہ جب سب کچھ بیوروکریسی کے ہاتھ میں گیا تو بیڑا غرق ہو گیا اور تباہی مچ گئی۔ ورنہ پاکستان اُس وقت کہاں ہوتا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اخلاق تباہ ہو گئے' بینک ختم ہو گئے' ذوالفقار علی بھٹو نے اس ملک کو کچھ بھی نہیں دیا۔ بے نظیر دو دفعہ آئیں' کیا دیا اُس نے اس ملک کو سوائے فساد اور کرپشن کے؟ اور آج بھی ایک صاحب بیٹھے ہیں وہ کون سا پھول برسا رہے ہیں؟ انہوں نے کبھی ملک کا کچھ فائدہ نہیں کیا' سوائے عیاشی اور بدمعاشی کے۔ اسی طرح جماعت اسلامی کے لوگ بھی وزیر بنے لیکن کچھ بھی نہیں کر سکے۔ اسی طرح اسلام کا نظام ضیاء الحق نے قائم کیا تھا' لیکن آج تک کسی کا ہاتھ نہیں کٹا' کسی کو سنگسار نہیں کیا گیا۔ ہاں پولیس والوں کے ریٹ بڑھ گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب تک افراد کی اصلاح نہیں ہو گی

آپ کیسے خیر کی توقع رکھتے ہیں۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم سسٹم کے اندر داخل ہو جائیں۔ آپ یہ پلاننگ کریں کہ ہمارے تربیت یافتہ دو ہزار ڈاکٹر ہونے چاہئیں۔ ہم ڈاکٹروں کے اندر محنت کریں گے اور ان ڈاکٹروں کو بہترین دینی ذہن کے ساتھ سسٹم میں داخل کریں گے۔ اور کہیں گے کہ بھائی جاؤ وہاں دین کا کام کرو۔ اپنے اخبارات کے اندر ان کو داخل کرو' جرنلزم کے اندر ان کو داخل کرو' میڈیا کے اندر اپنے لوگوں کو بٹھاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ سسٹم سے ٹکرانے سے سوائے سر پھوٹنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن آپ سسٹم کے اندر داخل ہونا چاہیں گے تو آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اپنے بچوں کو انجینئر بنا دیں۔ ہم نے کتنی محنت کی جلسوں پر' جلوسوں پر' ریلیوں پر۔ اصل کام جو ہمیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ افراد پر محنت کر کے ان کے فکر و نظر کو تبدیل کریں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ اچھی بات ہے کہ ایک سسٹم قائم کریں' لیکن ویسے نہیں ہوگا' پہلے اس کے لیے افراد تیار کرنے ہوں گے' آپ بہترین ڈاکٹروں کو اور بہترین انجینئروں کو اپنی طرف کھینچیں اور ان کا ذہن و فکر بنائیں اور وہ اس سسٹم میں خود داخل ہو جائیں۔ مودودی صاحب کہتے تھے کہ اسلامی انقلاب اس طرح آئے گا کہ ہمارے وزیر ہوں' ہمارے مشیر ہوں' ہمارے بیوروکریٹس ہوں' ہم سسٹم کو شیطانوں کے حوالے نہیں کر سکتے۔

س: علمائے کرام' مدارسِ دینیہ اور احیائی تحریکوں میں جو بُعد ہے اس میں کمی کس طرح ممکن ہے؟

ج: دیکھیں نا' جس کی جو حد ہے وہ تو اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے' یا جس تحریک کا جو کام ہے وہ سمجھتے ہیں یہی صحیح ہے دوسرا غلط ہے۔ باہمی محبتوں کے ذریعے سے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مقصد پر سب آ جائیں' اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ چاہے جماعت اسلامی ہو یا تنظیم اسلامی ہو' خواہ جمعیت العلماء ہو یا کوئی بھی ہو' وسعتِ قلبی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں۔ اب دیکھیں میں کبھی تنظیم اسلامی کے پروگرام میں نہیں گیا تھا' لیکن آپ نے بلایا تو چلا آیا۔ کچھ میں نے سمجھا کہ ماشاء اللہ اچھا کام کر رہے ہیں' دل میں عظمت پیدا ہوئی۔ اس طریقے سے سب کو اپنے قریب کریں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ یہ جو سوچ ہے کہ میں ہی سب سے صحیح ہوں باقی غلط ہیں' جیسے قرآن نے کہا:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾

''اور یہود نے کہا نصاریٰ کچھ نہیں راہ پر' اور نصاریٰ نے کہا یہود کچھ نہیں راہ پر' اور وہ سب پڑھتے ہیں کتاب''۔

یہ روش ہمیں چھوڑنا ہوگی' ایک دوسرے سے ملنا ہوگا' دل میں گنجائش پیدا کرنی ہوگی ؏ ''لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش!'' یعنی اتنی محبت کا معاملہ کرو کہ بیگانہ بھی اپنا ہو جائے۔ ہم نے تو اپنے کو بیگانہ بنا دیا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم وسعتِ قلبی پیدا کر لیں۔

س: تعلیم و تدریس کے میدان میں آپ کی گراں قدر خدمات ہیں' خصوصاً قرآن مجید کی تدریس کو نصابِ تعلیم بنانے کے حوالے سے۔ جو افراد اور ادارے اس میدان میں سرگرم عمل ہیں انہیں آپ کیا ہدایت دینا چاہتے ہیں؟

ج: بدقسمتی سے بات یہ ہے جس کی طرف آج تک توجہ نہیں دی گئی کہ جتنے ہمارے اسکول ہیں' چاہے پرائمری ہوں' سیکنڈری ہوں' کالجز ہوں' یونیورسٹیز ہوں' آپ یہ دیکھیں کہ ان تمام کے اندر یکساں تعلیم نہیں ہے' لہٰذا یہ قوم ایک قوم بن ہی نہیں سکتی۔ ہم تو ہزاروں اقوام اپنے گھروں کے اندر پیدا کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ انتشار کا شکار ہیں۔ دیکھیں نا مولوی بیچارہ کیا کرے' زیادہ سے زیادہ مسجد میں بیٹھے گا اور کیا کرے گا؟ یا مؤذن بنے گا یا کہیں مدرسہ میں بیٹھے گا' رہے گا تو وہ وہیں پر۔ باقی دوسرا طبقہ تو بڑا مؤثر طبقہ ہے' یہی کل حکمران بنے گا' اکانومی ان کے ہاتھ میں ہوگی' بیٹکاریہی ہوں گے' جب ہر چیز ان ہی کے ہاتھ میں ہوگی تو اصلاح کس کی ہونی چاہیے؟ ان کی اصلاح کریں۔ اس بات کو آپ اٹھائیں' تنظیمی اعتبار سے اس کو اٹھائیں۔ بدقسمتی سے ڈیفنس میں جو بچہ پڑھ رہا ہے وہ ایک الگ قوم ہے اور ادھر ناظم آباد میں جو بچہ پڑھ رہا ہے وہ الگ قوم ہے۔ ایک ہی شہر میں کئی قومیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ اسی طرح ہر صوبے کا الگ الگ نظام ہے اور ہر شہر کا الگ الگ نظام ہے۔ تو یہ ایک قوم کیسے بنے گی؟ ہم تو اپنے بچوں کو یورپ کی گلیاں سکھا رہے ہیں کہ یہ گلی اِدھر ہے دوسری گلی اُدھر ہے' دین کی وفاداری تو ہے نہیں۔ ان بچوں سے پوچھیں کہ کتنے اسلامی ممالک ہیں' ان کو پتا ہی نہیں ہوگا' یہ تو ہمارا حال ہے۔ ہم نے غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈالا ہوا ہے' کس سے شکوہ کریں؟ ہماری وزارتِ تعلیم کیا کر رہی ہے؟ ہم نے سارا کام کتابیں چھاپنے والے اداروں کو سونپا ہوا ہے' وہ اپنی مرضی سے جیسے چاہے کتابیں چھاپیں اور بیچیں۔ آپ اردو بازار چلے جائیں' دیکھیں کیا تماشا ہو رہا ہے؟ کتابیں تبدیل کرنے کے حوالے سے بات ہوتی ہے تو یہ لوگ پہنچ جاتے ہیں' کروڑوں روپے دے کر فیصلہ تبدیل کروا دیتے ہیں۔

میرے ایک دوست نے بتایا کہ ڈیفنس میں ایک اسکول ہے' وہاں بچے کو داخلہ سے پہلے پوچھتے ہیں کہ آپ کہاں رہتے ہیں؟ آپ کے ساتھ دادا' دادی تو نہیں رہتے؟ اگر اس نے کہہ دیا ہاں تو اس کو داخلہ نہیں دیں گے۔ اس لیے کہ اگر یہ ہوں گے تو وہ تو اپنی طرف ہی لے کر جائیں گے نا پرانے خیالات کی طرف! اس کے برخلاف آپ مدارس کا نظامِ تعلیم دیکھیں' میں تو کہتا ہوں کہ ان علماء کرام کو شاباشی دینی چاہیے' آپ یہاں سے خیبر تک چلے جائیں' ایک نظامِ تعلیم ہے کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف پاکستان میں نہیں' آپ افغانستان جائیں' سب جگہ ایک ہی نظامِ تعلیم مدارس کے حوالے سے ملے گا۔ یہ تو مدارس کا بہت بڑا چیلنج ہے۔ یہاں ہم پاکستان میں دیکھتے ہیں ایک بچہ اسکول جاتا ہے' اس کی

پیٹھ پر اتنا بڑا بستہ ہوتا ہے کہ اس کی کمر بوجھ سے جھک جاتی ہے۔ اس کے برخلاف کینیڈا میں آپ دیکھیں گے صرف ایک کاپی لے کر بچہ اسکول جا رہا ہے' ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ کچھ کا پیاں ہوتی ہے۔ یہاں تو سارا رٹا فیکیشن ہے۔ یعنی ہم نے کچھ کام نہیں کیا' سب سے زیادہ اہم' ریڑھ کی ہڈی تعلیم ہے اور ہم نے اس کا بیڑا غرق کر دیا۔ اور ہم اب نظام تعلیم آغا خان بورڈ کے حوالے کر رہے ہیں۔ کیوں بھائی' یہ پرنس آغا خان کون ہے؟ کس چیز کا پرنس ہے؟ اس نے کوئی ریاست قائم کر رکھی ہے یا نقلی پرنس بنا ہوا ہے؟ جو بے دین ہے ہم نے نظام تعلیم اس کے حوالے کرنا ہے' جس کی بنیاد بے دینی پر ہے۔ کیوں سارے کے سارے مر گئے؟ کوئی مفکر نہیں' کوئی مدبر نہیں ہے؟ جیسے بے نظیر مرگئی' ساری حکومت تمہاری ہے' تمام انٹیلی جنس ادارے تمہارے ہیں اور تحقیق کرے اقوام متحدہ؟ ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل علی گڑھ یونیورسٹی کے پاس ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو آیا اور کہنے لگا میں آپ کو ایک نظام تعلیم دیتا ہوں آپ اس کو چلائیں' تو ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ مجھے اگر دنیا کا بدترین نصاب دے دیں لیکن استاد قابل دے دیں تو میں اس کو بہترین بنا کر دکھاؤں گا' اور اگر آپ بہترین نصاب دے دیں اور استاد بدترین دے دیں تو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ آج ہم نے اساتذہ کو کوئی عزت نہیں دی' جس کا کچھ بھی کام نہیں ہوتا وہ ٹیچر بن جاتا ہے' کیسے بہتری آئے گی؟ غیر ملکوں میں ٹیچروں کو مہمان خصوصی بناتے ہیں' ہم وزیروں کو بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ ٹیچر ہمارے معمار ہیں' انہوں نے ہماری تعمیر کی ہے۔ تو ٹیچر تو بڑا قابل احترام طبقہ ہے' ان کی عزت ہونی چاہیے' ان کی تنخواہ سب سے زیادہ ہونی چاہیے' لیکن ہمارے ہاں ہوتا کیا ہے؟ اسکولوں کے اندر چھ چھ مہینے کی تنخواہ نہیں ملتی اور پانچ ہزار لکھوا کر ڈھائی ہزار دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے معاشرے میں ان ٹیچروں کو کیا دیا؟ ان بچوں بچیوں کو کیا دیا؟ ہاں البتہ ٹیچر کی باقاعدہ ٹریننگ ہونی چاہیے۔ تعمیر نو والے میرے پاس آئے کہ جی ہمارے اتنے اسکول ہیں۔ تو میں نے کہا آپ ایسا کریں میں یہاں چند دن تک موجود ہوں' آپ اپنے ٹیچرز کو میرے پاس بھیجیں' میں ان کو ٹریننگ دیتا ہوں' اگر ہم نے ٹیچرز کے اندر جذبہ پیدا کر دیا اور ان کو ٹرینڈ کر دیا تو ہم آگے بڑھیں گے۔ میں نے ڈھائی سو ٹیچروں کو سکھر میں جا کر ٹریننگ دی۔ الحمد للہ' میری کتاب ترجمہ قرآن کے ۵۴ ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور اب ۵۵ واں ایڈیشن چھپ رہا ہے۔

س: بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی پچاس سالہ مساعی اور تنظیم اسلامی کی ۳۴ سالہ جدوجہد کے بارے میں آپ کے تاثرات ہمارے قارئین یقیناً جاننا چاہیں گے۔

ج: ماشاء اللہ' مجھے اُمید ہے آپ لوگ بڑے اچھے کام کر رہے ہیں۔ مجھے آپ کے پروگرام میں جا کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ بڑے نظم و ضبط کے ساتھ آپ نے لوگوں کو بلایا' بڑے اچھے پڑھے لکھے لوگ ہیں' سب اپنے جذبے سے آئے تھے۔ خود ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ میں خود ان سے بے انتہا

متاثر ہوں۔ اسی لیے میں نے اس دن کھل کر بات کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کا QTV پر دورۂ ترجمہ قرآن باقاعدہ بالاستیعاب میں نے سنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت کی ہے' پوری زندگی اس میں لگائی ہے۔ ہوتا یہی ہے کہ ایک آدمی پودا لگاتا ہے اور اس کے بعد پودا پھلتا پھولتا ہے اور پھل دیتا ہے۔ ماشاء اللہ بڑی محنت کی ہے' اب ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ لوگ ان سے بہت باتوں میں اختلاف رکھتے ہیں۔ ہمارے مسلک کے حضرات بھی۔ لیکن میں نے ڈاکٹر صاحب میں سوائے ایک دو باتوں کے کبھی کمی محسوس نہیں کی۔ میں ان کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ ہاں یہ بات ہے کہ کبھی کبھی علماء پر برس پڑتے ہیں' وہ بھی ہمارا قصور ہے' ہمارے اندر بھی کمزوریاں ہیں' لیکن میرے خیال میں ان کو کھلے عام ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اور کبھی کبھی لہجہ ان کا بڑا سخت ہو جاتا ہے' وہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ دراصل آدمی کڑھتا ہے نا اندر اندر۔ جیسے میں نے تعلیم کے حوالے سے بات کی اور میں جذباتی ہو گیا' یہ ایک فطری بات ہے۔

ایک مشورہ یہ ہے کہ ہمارے اندر شخصیت سازی ہونی چاہئے۔ شخصیت سازی یہ ہوتی ہے' دیکھیں نبی اکرم ﷺ نے ذروں کو آفتاب و ماہتاب بنا دیا۔ ابوبکر تو کچھ بھی نہیں تھے' سبحان اللہ صدیق اکبرؓ بن گئے۔ حضرت عمر صرف عمر بن خطاب تھے عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن گئے۔ عثمان کو عثمان غنی رضی اللہ عنہ تو حضور ﷺ نے بنایا اور علی کو حیدر رضی اللہ عنہ تو حضور ﷺ نے بنایا۔ یہ حضور ﷺ کا فیض نظر ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ہر تنظیم کو چاہیے کہ افراد پیدا کرے۔ علامہ شبلی نعمانی نے بڑی اچھی بات کہی کہ اگر کوئی مجھ سے مختصر یہ پوچھنا چاہے کہ حضور ﷺ کی سیرت کیا ہے تو میں یہ کہوں گا کہ حضور اکرم ﷺ کی سیرت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سامنے ہی بڑا بنا دیا' ذروں کو آفتاب و ماہتاب بنا دیا۔ واہ کیا شان نبوی ہے! تو اصل چیز یہ ہے کہ شخصیت سازی ہونی چاہیے' افراد کو بنائیں' ان کو اٹھایا جائے۔ جماعتوں اور تنظیموں کے اندر یہ ہوتا ہے کہ وہاں ایک ہی آدمی کا نام ہوتا ہے' باقی کسی کو آگے نہیں آنے دیتے۔ بہت معذرت کے ساتھ' میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہی امیر تنظیم ہیں' یہاں آ کر معلوم ہوا کہ امیر اب عاکف سعید صاحب ہیں۔ یہ بہت اچھا ہے' اپنا قائم مقام ضرور ہونا چاہیے اور کچھ لوگوں کو قائم مقام بنانا چاہیے۔ مولانا مودودی صاحب نے بہت محنت کر کے افراد پیدا کیے' اس لیے آپ دیکھیں آج تک ان کی جماعت چل رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ ایسے ہی ہمارے علماء نے شخصیات پیدا کی ہیں' اس لیے الحمد للہ دین کے سارے کام چل رہے ہیں۔ اس لیے شخصیت کا پیدا کرنا ضروری ہے' اور جہاں کمی محسوس ہو وہاں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ ان شاء اللہ' اللہ نے چاہا تو کامیابی ہو گی۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کے کام کو اور بڑھائے اور آپ لوگ نوجوان محنت کر رہے ہیں' آپ لوگوں کو اللہ دن دگنی' رات چوگنی ترقی نصیب فرمائے' اور ان شاء اللہ ہم آپ کے لیے دُعا گو رہیں گے۔ ○○

امام معمر بن راشدؒ

۹۵ھ —— ۱۵۳ھ

عبدالرشید عراقی

امام معمر بن راشدؒ اُن خوش نصیب ائمہ حدیث میں سے ہیں جنہوں نے ممتاز تابعین اور اکابر تبع تابعین سے علومِ اسلامیہ میں استفادہ کیا۔ ان کے علم وفضل' حفظ و ضبط' عدالت و ثقاہت' امانت و دیانت اور تقویٰ وطہارت کا ارباب سیر اور مؤرخین نے اعتراف کیا ہے۔ ان کے اساتذہ اور تلامذہ نے بھی اس بات کی توثیق کی ہے کہ علم وفضل کے اعتبار سے امام معمر بن راشد اپنے دور کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ امام ابن جریج جو خود بہت بڑے محدث اور یگانہ عہد علماء میں سے تھے' اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے:

علیکم بمعمر فانه لم یبق فی زمانه اعلم منه (۱)

''معمر کے فیض صحبت سے مستفید ہو' اس لیے کہ اپنے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہیں رہا''۔

علمائے اسلام ان کی توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ علامہ ذہبی نے انہیں ''احد الاعلام الثقات الامام الحجة'' لکھا ہے (۲) جبکہ ابن عماد حنبلی نے ان کو ''عالم الیمن ثقة ورعة'' لکھا ہے۔ (۳)

علم وفضل کے ساتھ ساتھ امام ابن راشد تقویٰ وطہارت' زہد و ورع' صالحیت اور بلند ظرفی میں بھی ضرب المثل تھے' جیسا کہ حافظ ذہبی اور علامہ یافعی نے اس کی تصریح کی ہے: کان معمر صالحًا خیرا (۴) ''معمر نیک اور صالح تھے''۔

<u>عدالت وثقاہت</u>: امام ابن راشد کی عدالت وثقاہت کی اکثر علمائے جرح وتعدیل نے توثیق کی ہے۔ علامہ عجلی کا قول ہے:

بصری سکن الیمن' ثقة رجل صالح (۵)

''وہ بصرہ کے رہنے والے تھے' یمن میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ثقہ اور نیک انسان تھے''۔

علمائے جرح و تعدیل نے امام زہری سے ان کی مرویات کی توثیق کی ہے اور ان مرویات کو بلند پایہ قرار دیا ہے۔ امام یحییٰ بن معین جن کا شمار علمائے جرح و تعدیل کے اکابرین میں ہوتا ہے' فرماتے ہیں کہ: معمر اثبت الناس فی الزھری [6]

حدیث میں مرتبہ و مقام: امام ابن راشد علومِ اسلامیہ کے بحر زخار تھے۔ تفسیر قرآن' فقہ' تاریخ' ادب و لغت میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا' لیکن حدیث میں ان کا مرتبہ و مقام نہایت بلند تھا اور حدیث کے متعلقہ علوم پر بھی ان کی نظر بہت زیادہ وسیع تھی۔ ہزاروں حدیثیں ان کے خزانۂ دماغ میں محفوظ تھیں۔ ان کے شاگرد رشید امام عبدالرزاق بن ہمام جو خود بہت بڑے محدث تھے' بیان کرتے ہیں:

كتبتُ من معمر عشرة آلاف حديث[7]

''میں نے معمر سے دس ہزار حدیثیں لکھی ہیں''۔

وطن اور ولادت: امام معمر بن راشد ۹۵ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک شخص عبدالسلام بن عبدالقدوس کے غلام تھے۔[8]

تعلیم: ابتدائی تعلیم بصرہ میں حاصل کی۔ بصرہ میں آپ نے سب سے زیادہ اکتسابِ فیض امام قتادہؒ سے کیا۔ حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

سمعتُ من قتادة ولي اربع عشرة سنة' فما سمعته اذا كانّه مكتوب في صدري[9]

''میں نے قتادہ سے چودہ سال کی عمر میں سماع حاصل کیا تھا اور ان سے میں نے اُس وقت جو کچھ سنا تھا وہ گویا میرے قلب پر نقش ہو گیا تھا''۔

یمن روانگی: بصرہ میں آپ نے امام قتادہ اور دوسرے اکابر علماء سے استفادہ کیا اور رصافہ میں جا کر امام زہری سے تحصیل علم کیا۔ اس کے بعد آپ یمن تشریف لے گئے۔ یمن میں اس وقت مشہور صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد امام ہمام بن منبہؒ کا فیض جاری تھا۔ معمر ان سے پوری طرح مستفید ہوئے۔[10]

یمن میں جب آپ نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تو آپ نے اپنے وطن مالوف واپسی کا عزم کیا' لیکن اہل صنعاء جو ان کے علم و فضل' حسن اخلاق اور تقویٰ و طہارت سے بے حد متاثر تھے

ان کی وطن واپسی میں رکاوٹ بنے اور کسی بھی صورت میں ان کے واپس بصرہ جانے پر راضی نہ ہوئے۔ ایک شخص نے انہیں مستقل طور پر یمن میں روکنے کی یہ ترکیب نکالی کہ وہاں ان کا نکاح کر دیا۔ چنانچہ یمن امام معمر بن راشد کا وطن ثانی بن گیا۔(۱۱)

درس وتدریس: یمن میں آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور آپ سے بے شمار طلبہ نے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ کے مشہور تلامذہ یہ ہیں: سفیان ثوری' عبداللہ بن مبارک' عبدالرزاق بن ہمام' سفیان بن عیینہ' سعید بن ابی عروبہ اور عبداللہ بن معاذ وغیرہ۔(۱۲)

وفات: امام ابن راشد نے ۵۱ سال کی عمر میں رمضان ۱۵۳ھ میں اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔(۱۳)

حواشی

(۱) تهذيب التهذيب' ج۱۰' ص ۲٤٥۔

(۲) ميزان الاعتدال' ج۳' ص ۱۸۸۔

(۳) شذرات الذهب' ج۱' ص ۲۳٥۔

(٤) العبر في خبر من غبر' ج۱' ص ۲۲۱ ۔ ومرآة الجنان' ج۱' ص ۳۲۳۔

(٥) خلاصة تذهيب و تهذيب الكمال' ص ۳۸٤۔

(٦) ايضاً۔

(۷) تهذيب التهذيب' ج۱۰' ص ۲٤٥۔

(۸) تبع تابعين' ج۲' ص ۳۹۷۔

(۹) تذكرة الحفاظ' ج۱' ص ۱۷۱۔

(۱۰) مرآة الجنان' ج۱' ص ۳۲۳۔

(۱۱) الاعلام' ج۳' ص ۱٥۸۔

(۱۲) تهذيب التهذيب' ج۱۰' ص ۲٤٤۔

(۱۳) مرآة الجنان' ج۱' ص ۳۲۳۔

کھانسی، نزلہ، زکام
کسی موسم یا کسی وقت کے پابند نہیں

ہمدرد کی مجرب دوائیں ان کا علاج بھی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی مؤثر تدبیر بھی

صُدوری

مؤثر جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ خوش ذائقہ شربت۔ خشک اور بلغمی کھانسی کا بہترین علاج۔ صدوری سانس کی نالیوں سے بلغم خارج کرکے سینے کی جکڑن سے نجات دلاتی ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ بچوں، بڑوں سب کے لیے یکساں مُفید۔

شوگر فری صُدوری بھی دستیاب ہے۔

لعوق سپستاں

نزلے زکام میں سینے پر بلغم جم جانے سے شدید کھانسی کی تکلیف طبیعت نڈھال کر دیتی ہے۔ اس صورت میں صدیوں سے آزمودہ ہمدرد کا لعوق سپستاں، خشک بلغم کے اخراج اور شدید کھانسی سے نجات کا مؤثر ذریعہ ہے۔

ہر موسم میں، ہر عمر کے لیے

جوشینا

نزلہ، زکام، فلو اور اُن کی وجہ سے ہونے والے بخار کا آزمودہ علاج۔ جوشینا کا روزانہ استعمال موسم کی تبدیلی اور فضائی آلودگی کے مضر اثرات بھی دُور کرتا ہے۔ جوشینا بند ناک کو فوراً کھول دیتی ہے۔

سُعالین

مُفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سُعالین، گلے کی خراش اور کھانسی کا آسان اور مؤثر علاج۔ آپ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، سرد و خشک موسم یا گرد و غبار کے سبب گلے میں خراش محسوس ہو تو فوراً سُعالین لیجیے۔ سُعالین کا باقاعدہ استعمال گلے کی خراش اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔

سُعالین، جوشینا، لعوق سپستاں، صُدوری۔ ہر گھر کے لیے بے حد ضروری

ہمدرد

تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے:
www.hamdard.com.pk

Adarts-SJLS-1/2001

دعوت رجوع اِلی القرآن کا نقیب

علوم و حِکم قرآنی کا پرچارک

سہ ماہی **حکمتِ قرآن** لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر مسؤل: ڈاکٹر اسرار احمد

قیمت فی شمارہ: 50 روپے — سالانہ زرِ تعاون (اندرونِ ملک) 200 روپے

تحریک خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ **ندائے خلافت** لاہور

حالات حاضرہ، سیاسی تجزیئے، ہلکے پھلکے علمی،
معلوماتی، تحریکی مضامین اور رپورٹیں

مدیر مسؤل: حافظ عاکف سعید

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ زرتعاون (اندرون ملک) -/300 روپے

مکتبہ خدام القرآن 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 3-042-35869501، فیکس: 042-35834000، email: maktaba@tanzeem.org

January 2010
Regd CPL No. 115
Vol.59
No.1

Monthly Meesaq Lahore

داعیٔ رجوع الی القرآن' بانیٔ تنظیم اسلامی

صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** حفظہ اللہ

کا شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن

بعنوان

بیانُ القرآن

جو کہ مختلف ٹی وی چینلز سے سیٹلائٹ کے ذریعے نشر ہو کر پوری دنیا میں دیکھا اور سنا گیا ہے
اور جس کے ذریعے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں ایک نمایاں تبدیلی آئی ہے

کتابی صورت میں شائع ہونا شروع ہو گیا ہے

انجمن خدام القرآن سرحد' پشاور نے اس 'بیانُ القرآن' کا حصہ اوّل جو سورۃ الفاتحہ
اور سورۃ البقرۃ' مع تعارفِ قرآن پر مشتمل ہے' شائع کیا ہے

☆ عمدہ طباعت ☆ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ☆ امپورٹڈ پیپر
☆ صفحات: 520 ☆ قیمت: 400 روپے

ملنے کے پتے:

● انجمن خدام القرآن سرحد' پشاور
A-18 ناصر مینشن' ریلوے روڈ نمبر 2' شعبہ بازار پشاور' فون: 2584824,2214495(091)

● مکتبہ خدام القرآن لاہور
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501(042)